آئینہ آج کا

سلطان آزاد

آئینہ آج کا

سلطان آزاد

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

AAINA AAJ KA (Afsanvi Majmua)
By : SULTAN AZAD

(۱) ''اِس کتاب کی اِشاعت میں بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔''
(۲) ''کتاب میں شائع مشمولات یا کسی قابل اعتراض مواد کے لئے بہار اُردو اکادمی ذمہ دار نہیں ہے۔''

افسانوی مجموعہ کا نام	:	آئینہ آج کا
مصنف و ناشر	:	سلطان آزاد
ضخامت	:	۱۰۴ر صفحات
قیمت	:	۲۵۰ر روپے (Rs.250/-)
تعداد	:	۵۰۰
سن اشاعت	:	۲۰۱۴ء
کمپوزنگ	:	افتخار عظیم چاند، پٹنہ
موبائل	:	9504890054/9631783990
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس
زیر اہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ملنے کے پتے:

8084694103

- سلطان آزاد، ''مکتبۂ آزاد''، پٹنولین، گلزار باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۷
- بک اِمپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴ (بہار)
- مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، علی گڑھ و ممبئی
- میزان پبلیشرز، سری نگر (کشمیر)

اِنتساب

اپنے دادا حکیم شیخ محمد علی جان صاحب مرحوم و مغفور

کے نام

جنہیں قصّے، داستان اور کہانیاں

پڑھنے کا بڑا ذوق تھا۔!

/

/

/

سلطان آزاد

(الف) حکیم شیخ محمد علی جان مرحوم حکمت کے علاوہ بہار گورنمنٹ پریس، گلزار باغ، پٹنہ کے ایک سیکشن کے سیکشن ہولڈر تھے۔

(ب) حکیم شیخ محمد علی جان مرحوم کا تذکرہ معروف کتاب ''تاریخ اطبائے بہار'' (جلد دوم) از حکیم محمد اسرار الحق (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) میں درج ہے جو میرے حوالے سے شامل کتب ہے۔

(س۔ا)

ترتیب

========

گفتنی

سلطان آزاد کشمکش کو اپنے افسانوں میں خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار کسی حد تک سپاٹ ہوتے ہیں، لیکن اپنے مسائل ساتھ لے کر آتے ہیں اور موضوع سے مطابقت رکھتے ہوئے حقیقت پسندی کو اپناتے ہیں۔

سلطان آزاد کی فکر ونظر میں نفسیاتی پہلو بھی اُجاگر ہوتے ہیں جو ان کے رنگ وآہنگ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں معنویت اور سادگی ہے۔ وہ بیانیہ انداز کو اپناتے ہیں اور کسی بھی طرح کے ابہام کو راہ نہیں دیتے ہیں:

"راجن! میرا ماضی میری اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں، تم مزید نہ کریدتے تو زیادہ بہتر تھا...... لیکن تم محض اس بات کو جاننے کی خاطر مجھ سے خفا ہو بیٹھے۔ اس لئے چند لفظوں میں واضح کردیتی ہوں کہ جو چیز میں نے آج اس دکان سے خریدی ہے، تم اسے جان گئے ہو۔ ہاں ......راجن! وہی شراب اب میری زندگی ہے اور شائد میرے ماضی کا عنوان بھی۔" اتنا کہہ کر وہ نہ صرف اپنے ٹیبل کی طرف چلی گئی بلکہ فرصت سے قبل ہی دفتر سے بھی چلی گئی۔"

(افسانہ: پیاس)

سلطان آزاد تغیرات اور تبدیلیوں کو براہ راست بیان کرتے ہیں۔ محرکات اور جذبات سے اثر پذیری کے تحت ماحول کی سنگینی کو معاشرتی اور ضمیر کی آواز کے حوالے سے

اُبھارتے ہیں:

''اس کے سامنے نشاط چت پڑی تھی۔اس کی بند آنکھیں، گورے چٹے گلابی گال، رس بھرے ہونٹ اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمی ہوئی تھیں جو بلب کی تیز روشنی میں چمک رہی تھیں۔شائد اس کی دی ہوئی نشے کی گولی اب پوری طرح اثر کر چکی تھی۔اس کے سینے کا نشیب و فراز سانس کی حرکتوں سے ہچکولے کھا رہا تھا۔اس منظر کو دیکھ کر اکرم مدہوشی کے عالم میں اپنے آپ کو بھول گیا اور اس کے قریب تر ہو گیا۔اب تو اس کے اندر چھپا ہوا اور سویا ہوا مرد بھی جاگ اُٹھا تھا۔اور پھر وہ ایک لامتناہی حد کو پار کر چکا تھا۔پھر ایک جھٹکے میں اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے قاتل کو کسی کے قتل کرنے کے بعد ہوتی ہے۔تب اس کو اپنے گناہ کی انجام دہی اور پشیمانی کے ایک بڑے خوف کا ایسا دباؤ محسوس ہوا کہ اس نے کالج اور ہاسٹل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راہِ فرار اختیار کر لی۔''

(افسانہ: کفارہ)

معاشرتی جبر اور استحصال کے خلاف سلطان آزاد نے ایک عمدہ کہانی ''جھک گیا آسمان'' لکھی ہے۔اغوا کر کے لڑکوں کی شادی کر دینے کا رواج دیہاتوں میں آج بھی ہے۔ سلطان آزاد نے شادی بیاہ کے اس رسم پر گہرا طنز کیا ہے۔اور ٹریٹمنٹ سے کئی فطری اور نفسیاتی پہلو اُجاگر کئے ہیں:

''جانتے ہیں، یہ سب کیسے ہوا؟ کل وہ سامنے والے میدان میں''۔اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا''بغل والے گاؤں سے فٹ بال میچ تھا۔اس میں اس گاؤں کے مکھیا نریش سنگھ کا لڑکا دنیش سنگھ بھی کھیلنے والا تھا جس کی خبر سرپنچ جی کے خاص نوکر کو تھی۔بس کیا تھا، کچھ دوستوں اور سرپنچ جی کے پروگرام کے مطابق میچ کے فوراً بعد اس گاؤں کی ٹیم کے اس کھلاڑی کا اغوا کر لیا گیا تاکہ اس سے سرپنچ جی کی بیٹی کی شادی ہو جائے۔اور ایسا ہی ہوا بھی۔لیکن جیوں

ہی شادی کے لئے دونوں کا ساتواں پھیرا پورا ہوا اور دھرم کے مطابق سیندور کی رسم کے بعد کنیا دان کا وقت آیا عین اسی وقت جب ڈومن دوسادھ کو خبر ملی کہ اس کے بھانجہ سے سرپنچ جی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے تو وہ دوڑا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے بولا ”سرپنچ جی! یہ شادی روک دیجئے یہ لڑکا دنیش سنگھ نہیں، یہ تو میرا بھانجہ دیوا کر پاسوان ہے۔“

(افسانہ: جھک گیا آسمان)

ہمیشہ کا ایک موضوع ہندو مسلم فساد رہا ہے۔ آج بھی جمہوریت نواز حکومت کی سازش سے اقلیتی فرقے کی بے بسی پر ضرب کاری اکثریتی فرقے کے لوگ لگاتے رہتے ہیں۔ اور زندگی آموز منطق فنا ہوتی رہتی ہے۔ برخود غلط مشروط مذہبیت کی وجہ سے فتنہ وفساد کی زد پر سلطان آزاد کے دو کردار شبنم اور رینو بھی ہیں۔ شبنم نے رمن کو بھائی مانا تھا، لیکن جب فساد پھوٹ پڑا تو وہ صرف درندہ رہ گیا۔ رشتے کا تقدس وہ بھول بیٹھا۔ اس کے ضمیر کے جھنجھوڑنے کے لئے سلطان آزاد نے رمن کے سامنے رینو کو لا کھڑا کیا ہے تا کہ ریزہ ریزہ اور پاش پاش ہوتی ہوئی انسانیت آرزومند بن سکے اور ارتقاع پذیر امکان صورت پذیر ہو سکے:

”وہ پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ اب میں نہیں بچ سکتی کیونکہ باہر بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ موت کی گھبراہٹ اور پھر لٹنے کا غم .... وہ کافی نروس ہوگئی اور اس کا سارا جسم تھرانے لگا۔ رمن فتح یابی کی مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان سے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ یہ جان چکا تھا کہ وہ اب بالکل تھک چکی ہے۔ اُدھر شبنم اپنے کو بچانے کی غرض سے پیچھے کی طرف سرکنے لگی۔ لیکن کہاں تک......؟ آخر اس کی کھسکتی ہوئی ٹانگ کنویں میں غراپ سے لے گئی۔ رمن نے اپنی ناکامی پر غصے کی حالت میں اپنے دانتوں کو پیستا ہوا دروازے کو ایک ہی جھٹکے سے کھولا...... اور بالکل حیران سا رہ گیا۔ کیونکہ اس کی نظر ایک ایسی صورت پر جا ٹکی جسے دیکھ کر سر شرم سے جھک گیا...... رینو! سامنے والے پوال کے ڈھیروں پر

بالکل برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ بلاؤز اور اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ندارد، آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو، گالوں پر بے شمار دانتوں کے نشان تھے۔ وہ اپنی سگی بہن کی ایسی درگت دیکھ کر غصہ سے کانپ اُٹھا۔ لیکن اس کی نظر کے سامنے یکا یک شبنم کا چہرہ گھومنے لگا جو کنویں کے گہرے پانی میں لقمۂ اجل بن گئی تھی......''

(افسانہ: اپنا دُکھ)

سلطان آزاد کے افسانوں میں لہجے کی بیزاری، تلخی اور بے تابی ہے جو اُن کے تخلیقی جذبے کو مہمیز کرتی ہے۔ اُنہوں نے جن موضوعات کو چھوا ہے ان میں سنجیدگی اور قدرے یاسیت ہے۔

سلطان آزاد نے افسانچے بھی لکھے ہیں جو سیدھے سادے اور بیانیہ انداز میں ہیں۔ یہ افسانچے زندگی کی آب جو کے اَن مٹ پانی میں تہذیبی انہماک اور وابستگی کے ساتھ پیرائی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

سلطان آزاد کے افسانے اور افسانچے تہذیب و تمدن کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اُنہوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے، قومی یک جہتی کے جذبہ کو فروغ دینے، حُب الوطنی کی آنچ کو تیز کرنے، امن دوستی کے رشتے کو مستحکم بنانے اور سماج کے کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کی فلاح کی خاطر بعض افسانے لکھے ہیں اور وضع داری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ کہیں کہیں پر انسانی دُکھ اور درد کی ٹیس روح کی جڑوں تک اُتر جاتی ہے۔!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

Kohsaar,Bhikanpur-3,Bhagalpur-812001(Bihar)

Mob.:09430966156

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اپنی بات

میرے ادبی ذوق کو صفحۂ قرطاس پر لانے میں دو نیم ادبی رسائل، ماہنامہ ''شمع'' اور ''روبی'' (دہلی) محرک بنے۔ ان دونوں رسائل کا مطالعہ اگرچہ فلمی دلچسپی کے باعث پابندی سے کرتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ دونوں رسائل میں شامل افسانے بھی دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ مختصر یہ کہ افسانے کی دلچسپی اور لکھنے کی ترغیب وتحریک ان دونوں رسائل شمع اور روبی ہی سے ملی۔

میں نے گزشتہ تقریباً چار دہائی سے لکھنے پڑھنے کا ذوق وشوق پیدا کیا ہے اور سن ۱۹۷۷ء سے باضابطہ لکھنا شروع کیا ہے۔ میں نے ہر صنف مثلاً افسانہ، افسانچہ، فیچر، تنقید وتحقیق، رپورتاژ، ریڈیائی ڈراما، طنز ومزاح، ادب اطفال (بچوں کی کہانیاں) اور تبصرہ کتب پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور شروع ہی سے پوری لگن ودل جمعی سے زبان وادب کی خدمت میں لگا ہوا ہوں جس کے نتیجے میں میری چند تصانیف بھی باضابطہ طور پر منظر عام پر آچکی ہیں۔

میرا پہلا افسانہ ''جنون'' ہفت روزہ ''پندار''، پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد جو بھی افسانے میں نے لکھے، وہ سبھی ریڈیو پٹنہ کی اُردو سروس کے لئے۔ ان میں دو افسانے ''تنہا چاند'' (پہلے اس کا عنوان ''چار دِن کی چاندنی'' تھا) اور ''پیاس'' آل انڈیا ریڈیو کے اُردو ترجمان ''آواز''، دہلی میں بھی شائع ہوئے۔ بقیہ افسانے صرف ریڈیو سے نشر ہوئے۔ البتہ میرے افسانچے یعنی منی افسانے ملک کے کئی اہم رسائل مثلاً ماہنامہ ''روبی''، ''خوشبو''، ''پالیکا سماچار'' (دہلی) اور ''شہود'' (کلکتہ) وغیرہ میں شائع ہوئے۔

افسانچے سے متعلق ایک کتاب بعنوان ''بہار کی ہندی لگھو کتھائیں'' (ہندی) از ڈاکٹر ستیش راج پشکرنا مطبوعہ ۱۹۸۸ء میں میرا افسانچہ ''گنہگار'' شامل ہوا۔ بعد میں دوبارہ افسانچوں کا ایک مجموعہ (ہندی) ڈاکٹر ستیش راج پشکرنا نے شائع کیا۔ اس وقت اُنہوں نے میرے اسی افسانچہ کو دوسرے عنوان ''آئینہ آج کا'' شامل کتب کیا۔ اس کا اُردو ترجمہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔

''اُردو میں منی افسانہ'' از آمنہ آفریں (تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد) مطبوعہ ۲۰۰۹ء میں خاکسار کے دو منی افسانے (افسانچے) ''آئینہ آج کا'' اور ''قانون'' مختصر تعارف کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ایک مقالہ بعنوان اُردو منی افسانہ: آغاز و ارتقا'' میں اُنہوں نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ ''سلطان آزاد کے منی افسانے ''تضاد''، ''آئینہ آج کا'' اور ''قانون'' وغیرہ اور ف.س. اعجاز کے افسانے...... وغیرہ منی افسانے کے اعلیٰ معیار پر پورے اُترتے ہیں۔''

کہانیاں دراصل واقعات کا حصہ ہوتی ہیں جو آئے دِن ہم سماج میں دیکھتے،

سنتے اور محسوس کرتے ہیں۔ان واقعات کو تخلیقی شکل دے کر کہانی بُننا اگر چہ فنکاری ہے۔ میں اس فن میں کہاں تک کامیاب ہوا۔یہ قاری فیصلہ کرے گا یا پھر ناقد۔لیکن میں یہ عرض کردوں کہ میں نے جو افسانے لکھے ہیں کسی مخصوص اصول اور قوانین وضوابط کے دائرے میں مقید ہو کر نہیں۔البتہ جو واقعات مجھے میرے احساسات اور خیالات کے کہانی بُننے کے محرک بنتے ہیں۔اسے کہانی کی شکل دینے میں مجھے آسودگی ملتی ہے۔ ہماری کہانیوں کے احساسات سے ڈاکٹر قیام نیر نے بھی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے اپنی مطبوعہ کتاب ''بہار میں اُردو افسانہ نگاری ابتدا تا حال'' مطبوعہ ۱۹۹۵ء میں خاکسار کے متعلق تحریر کیا ہے کہ'' ....،ان کی کہانیوں میں ایسے سماج کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جس میں وہ رہتے ہیں۔وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اُسے قلمبند کرتے ہیں۔''

مختصر یہ کہ میں نے جو بھی کچھ لکھا ہے ذاتی تسکین اور آسودگی کے لئے۔ساتھ ہی ایک والہانہ لگاؤ ہے اپنی مادری زبان اُردو اور اُردو ادب سے۔

O-------------O
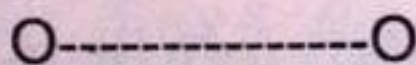
سلطان آزاد

افسانے

کیسی بھاگ کی لیک

اَناتھ آشرم میں اُسے ایک سال سے بھی زیادہ بیت چکے تھے۔ کل تک اُسے کچھ بھی خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے؟ اس کے والدین کون ہیں؟ اور وہ یہاں کیوں کر اور کس طرح آ گئی ہے؟ یہ دھماکہ اس کے دِل و دماغ میں اُس وقت پیدا ہو گیا، جب اُس بستی میں رات کے وقت ایک بارات کافی دھوم دھماکوں کے ساتھ آئی تھی۔ تبھی اس کے دماغ میں دبی ساری باتیں یکے بعد دیگرے سامنے آنے لگیں۔ اور اس کا پورا ذہن ماضی کی طرف جست کر گیا............ ماضی کے دریچوں کے اس پار گئی بیتے ہوئے پَل آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے............ ونود، جسے وہ خود بھی پسند کرتی تھی اور اس کے والدین بھی۔ ساتھ ہی ونود کے ماتا پتا اُسے اپنی بہو بنانے کی بات بہت پہلے ہی پکّی کر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سدھا میٹرک کا امتحان مادھیمک کنیا وِدھیا لیہ سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کر گئی اور اُدھر ونود بھی بی۔ ایس۔ سی۔ مکمل کر چکا تب اس کے پتا اور ونود کے بابو جی دونوں نے پنڈت جی کو بُلا کر شبھ گھڑی طے کی۔ اِس طرح کافی انتظار کے بعد ایک ایسی حسین شام بھی آئی جب اس کی بارات بہت دھوم دھماکوں

کے ساتھ آئی اور پھر باراتیوں کے ذریعے چھوڑی گئیں آتش بازیوں سے پورا علاقہ روشن ہوگیا۔ اُدھر سدھا ایک خاص کمرے میں مسہری پر ایک کونے میں دیگر عورتوں اور لڑکیوں کے درمیان سکڑی سمٹی دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ ابھی رات جوان بھی نہ ہوئی تھی کہ رسموں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پنڈت جی نے اشلوک پڑھے اور پھر اگنی کے پاس جنم جنم کے سات پھیرے لگائے گئے۔ اور رات کے آخری حصّے میں اس کی شادی انجام پائی۔ اس طرح وہ ونود کی اور ونود اس کا ہوگیا۔ یہ لمحہ اس کے ذہن میں آتے ہی، اس کے من میں گدگدی سی ہونے لگی اور وہ خوشی سے سرشار ہوکر جھوم اُٹھی۔

صبح کے وقت جب اس کی رُخصتی کا وقت آیا وہ اپنے باپو کا گھر چھوڑتے وقت کانپنے لگی۔ اور اِس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ گھر کے سبھی لوگوں کے علاوہ محلے کے سارے لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسی دوران اس کے گھر والوں نے اُسے موٹر کار میں بٹھایا جس میں اس کا شوہر ونود پہلے ہی سے بیٹھا تھا۔ اب کار آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور یکایک تیزی سے اسٹیشن کی طرف جانے لگی۔ اِس طرح اس کا دِل بھی پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی کار اِسٹیشن پر جا لگی جہاں میل ٹرین اس کی منتظر کھڑی تھی جس میں اس کو سوار کیا گیا۔ جس ڈبے میں وہ سوار ہوئی اسی ڈبے میں اس کا ونود اور دیگر لوگ بھی ایک طرف بٹھائے گئے تھے۔ شائد وہ ڈبہ ریزرو تھا۔ ابھی چند ساعت بھی نہ گزری تھی کہ یکایک سیٹی کی تیز آواز گونجی اور ٹرین آگے کی جانب آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ پھر وہی ٹرین برق رفتاری کے ساتھ بھاگنے لگی۔ ٹرین میں بیٹھے ہوئے لوگ اب ذوروں سے ہلنے ڈولنے بھی لگے تھے۔ باوجود اس کے کچھ لوگ اپنے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہوگئے۔ ونود بھی موقع پا کر اس

کے قریب تر ہونے لگا اور شائد لوگوں کی نظریں چُرا کر اپنی دلہن سدھا کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہی تھا کہ اسی دوران ...... دھڑام ...... دھڑام ...... کی ایک عجیب سی بھیانک اور دل خراش آواز ہوئی۔ سدھا ایک زوردار آواز میں چیخ اُٹھی ......

"نہیں ...... نہیں ...... کہہ کر وہ اُسی جگہ زمین پر گر پڑی جہاں وہ کھڑی تھی اور بے ہوش ہوگئی۔ اُناتھ آشرم کی لڑکیاں اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ آشرم کے بابا بھی دوڑ کر اس کے پاس آئے۔ اس کی سہیلی لڑکیوں میں سے ایک دو نے اس کے مُنہ پر پانی کے کئی چھینٹے دیئے۔ دوسری طرف کچھ لڑکیاں آپس میں چہ میگوئیاں بھی کر رہی تھیں کہ "لگتا ہے کہ سدھا بارات میں چھوڑے گئے پٹاخے اور آتش بازیوں کی آواز سے بے ہوش ہوگئی ہے" اور ایک دو نے یہ بھی کہا "لگتا ہے کی سدھا کو مرگی کا روگ ہے۔ اسی لئے بارات میں کافی بھیڑ دیکھ کر بے ہوش ہوگئی ہے۔" اسی اثناء میں سدھا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ اپنے قریب اُناتھ آشرم کی لڑکیوں اور بابا کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر زوردار آواز میں پوچھنے لگی ......

"بابا، میں یہاں کیسے آئی؟ ...... میں یہاں کیسے آئی؟" ...... اور یہ کہتے کہتے وہ دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔ بابا اُناتھ آشرم ہی میں رہتے تھے۔ اناتھ آشرم اُنہوں نے اس وقت قائم کیا تھا جب ان کی بیٹی سمترا عین جوانی کے عالم میں فوت کر گئی تھی جسے وہ بے حد چاہتے اور پیار کرتے تھے۔ سمترا کو چاہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف اُن کی اکلوتی بیٹی تھی بلکہ ان کی زندگی کے جینے کا مقصد تھی۔ کیونکہ اس کی ماں بچپن ہی میں پرلوک سدھار چکی تھی۔ سمترا کی حادثاتی موت نے سیٹھ دھرم داس کو بابا دھرم داس بنا دیا تھا۔ بابا دھرم داس جو اَب اس علاقے میں صرف بابا کے نام سے ہی مشہور تھے، اُنہوں نے

اپنی ساری جائداد اور زمین کو چھوڑ کر فلاحی کاموں کی طرف مائل ہونا پسند کیا اور آشرم کو اپنے جیون کی شانتی کا مارگ سمجھا۔ شائد یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے اپنے طور پر ایک اناتھ آشرم بنوایا تھا۔ اِس طرح بابا کے اناتھ آشرم کے بن جانے کے بعد بے سہارا لڑکیوں اور مجبور عورتوں کے رہنے کے لئے ایک اور گھر ہو گیا تھا۔

سدھا بھی ایک حادثہ کا شکار ہونے کے بعد اِس آشرم میں لائی گئی تھی۔ بابا جو اب بھی اُس کے پاس بیٹھے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، اسی لمحہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ واقعہ پھر گیا جو آج سے ایک سال قبل اسی بستی کے آخری حصّے کے قریب جہاں ایک بڑی سے ندی واقع ہے، رونُما ہوا تھا جب میل ٹرین کی کئی بوگیاں کسی تکنیکی خرابی کے باعث پٹری سے اُتر کر گر پڑی تھیں۔ اس دِن پوری بستی میں ایک عجیب سا ہنگامہ برپا تھا۔ ٹرین پر سوار بہت سے لوگ تو اسی وقت فوت کر گئے تھے اور ان گنت مسافر زخمی پڑے چوٹ کے باعث درد کی شدت سے کراہ رہے تھے جن میں سے بیش تر کی زندگی موت کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی کہ بروقت کوئی طبّی امداد نہ مِل سکی تھی۔ اگر اُنہیں طبی مدد فوری پہنچائی جاتی تو ان میں سے کچھ مسافروں کو بچایا جا سکتا تھا، لیکن فوری طور پر یہ ممکن بھی نہ تھا۔ اُلٹی ہوئی ایک بوگی کے نزدیک ایک لڑکی جس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا، بے ہوشی کی حالت میں وہاں پڑی ہوئی تھی جسے بابا نے ہوش میں لایا، مگر ہوش میں آنے کے باوجود اُسے کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آ رہی تھی؟ کہاں جا رہی تھی؟ اور اس کے ساتھ کون کون لوگ تھے؟ آخر کار بابا تھک ہار کر اسے اپنے آشرم میں لے آئے تھے اور اس کو اپنی بیٹی کی مانند رکھا کیونکہ اس کی شکل و شباہت بہت حد تک ان کی بیٹی سمترا سے ملتی جلتی تھی۔ سدھا کی چیخ ”میں یہاں کیسے آئی؟

...... میں یہاں کیسے آئی؟'' ...... بابا کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آنے لگی کہ سدھا اپنی اصلی حالت میں آچکی ہے اور اس کی یادداشت واپس آگئی ہے۔ وہ خوش تھے کہ سدھا کو اب پھر سے ایک نیا جیون ملے گا، جسے وہ کھو چکی تھی۔ سدھا جب دوبارہ ہوش میں آئی تو اس نے بابا کو سارا واقعہ سنا دیا کہ کل بستی میں آئی بارات کے ہنگاموں کی وجہ سے اس کی یادداشت واپس آگئی ہے۔ اور وہ اب اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ یہ سنتے ہی بابا کو کافی مسرت ہوئی اور وہ اسے لے کر اس کے گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

سدھا آج بہت خوش تھی۔ وہ بابا کے ہمراہ اپنے گھر جا رہی تھی جہاں سے پھر وہ دوبارہ اپنے سسرال چلی جائے گی اور اپنے بچھڑے ہوئے ونود سے ملے گی۔ پھر سے اس کی ساری خوشیاں لوٹ آئیں گی اور اس کے سامنے رقص کرنے لگیں گی۔ سارے لوگ اور اس کے پتی کتنے متعجب اور خوش ہوں گے جب وہ مجھے زندہ سلامت اپنے پاس دیکھیں گے۔ اس کے دِل میں طرح طرح کی باتیں آرہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ وہ سچ مچ بہت زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔ لیکن جب اس کا خیال دوسری طرف جاتا تو وہ گھبرانے بھی لگتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا ونود اسے نہ ملے! یا ایسا نہ ہو کہ ونود اس حادثے میں ...... نہیں ...... نہیں ...... بھگوان نہ کرے۔ یہ سوچ کر وہ یکا یک چونک جاتی، لیکن پھر وہ اپنے لوگوں سے ملنے کی بات سوچ کر مچلنے لگتی کہ کیسے جلدی وہ اپنے گھر پہنچ جائے۔ اسی درمیان اس کی ٹرین گھر کے اسٹیشن پر آگئی اور وہ بابا کے ہمراہ رکشا پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ گھر پہنچتے ہی سدھا تیزی سے اپنے مکان کے اندر داخل ہوئی اور زور زور سے ممی، ممی کہہ کر پکارنے لگی۔ اس کی ممی اور پاپا اسے زندہ سلامت دیکھ کر پہلے تو چونکے اور پھر حیران نگاہوں سے اُسے گھورنے لگے۔ سدھا نے جب اُنہیں خوشی اور

تعجب کے ملے جلے آثار کے ساتھ یہ بتایا کہ...... ''پاپا...... پاپا، ممی...... ممی، میں سدھا ہوں، آپ لوگوں کی بیٹی سدھا جسے آپ لوگوں نے ونود سے بیاہ کر وِداع کر دیا تھا۔ ممی! میں ٹرین حادثہ میں بچ گئی تھی ...... لیکن ممی، میں اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ اِن سے پوچھو...... یہ بابا ہیں، مجھے اس ندی سے نکال کر اپنے اناتھ آشرم میں لے گئے تھے اور وہاں شرن دیا تھا۔ برسوں بعد اس گاؤں میں ایک بارات آئی تھی۔ دھوم دھما کا نے مجھے یاد دِلا دیا کہ میں کون ہوں؟ میرا گھر کہاں ہے؟ اور اِس طرح بابا کی مدد سے میں آپ لوگوں کے پاس چلی آئی۔ اتنی باتیں سن کر سدھا کی ماں اسے اپنے گلے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسری طرف اس کے پاپا کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ یکا یک اس کی نظر کمرے میں رکھے ہوئے ٹیبل پر جا اٹکی، کیونکہ ٹیبل پر رکھے ہوئے پکچر فریم میں اس کی چھوٹی بہن اوشا کے ہمراہ ونود کے بیاہ کی تصویر لگی تھی، جسے دیکھ کر وہ ایک بار پھر چیخ اُٹھی...... ''نہیں ......نہیں ......'' اور دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ اِس حادثاتی منظر کو دیکھ کر اس کی ممی اور پاپا، اس کی طرف لپکے۔ تب تک بابا اسے دوبارہ ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب سدھا ہوش میں آئی تو اُسے اس جگہ کی ہر چیز انجانی معلوم ہو رہی تھی اور وہ تمام لوگ بھی جو اُس کے قریب کھڑے ہوئے تھے اجنبی، حتیٰ کہ بابا کو بھی وہ بالکل بھول چکی تھی۔!

☆☆☆

پیاس

حسبِ معمول جب میں دفتر کے لئے گھر سے نکلا تو دُور ہی سے دفتر کے قریب انسانی سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آیا۔ جیوں جیوں دفتر کے قریب ہوتا گیا، میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اُبھرنے لگے۔ دفتر کے آس پاس اتنی بھیڑ کیوں ہے.........؟ کیا کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔ نہیں......نہیں، لگتا ہے کہ آج یونین والوں اور کمپنی کے درمیان کچھ ہوگیا ہے۔ بہت دِنوں سے یونین اور منیجر کے بیچ ان بن چل رہی تھی۔ یکا یک میرا ذہن دوسری طرف جست کرگیا جو میرے لئے ایک حادثہ سے کم نہیں تھا۔ مجھے اب بھی خوف محسوس ہورہا تھا کہ مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوگیا ہے۔ اِس کے باوجود میں مجرم نہیں ہوں کہ یہ گناہ مجھ سے شعوری طور پر سرزد نہیں ہوا تھا۔ اِس میں میرا کوئی ہاتھ بھی نہیں تھا.........نہیں چاہنے اور بچنے کی کوششوں کے باوجود میرا دامن داغدار ہو ہی گیا۔ میں اس کا سامنا کس طرح کرسکوں گا؟ اس کی بس ایک ہی صورت ہے۔ میں دفتر جانا چھوڑ دوں......مگر پھر بے روزگاری......؟ کیا کروں؟ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ یہ سوچے بغیر کہ راہ چلتے دوسرے راہگیر میری

اِس حرکت پر کیا کہہ رہے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا...... وہ آج دفتر آئے گی...... اور اس کے جملے میرے ذہن میں گونجنے لگے...... ''میں شرمندہ ہوں اور مجبور بھی...... میرا ماضی، میری اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں......'' ذہنی گتھیوں میں کافی اُلجھا، میں بھیڑ کے قریب تر ہو گیا۔ ابھی اُس ہجوم کے دو چار قدم پیچھے ہی تھا کہ لوگوں کی باہمی بات چیت سے یہ اندازہ ہوا کہ یہاں واقعی کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ یہ سنتے ہی مجھے فکر لاحق ہوئی کہ دفتر کے پاس کسی کے ساتھ کوئی واقعہ رونما ہوا ہے۔ جیوں ہی اس ہجوم میں شامل ہوا تو بھیڑ میں کھڑے ایک انجانے شخص نے بتایا کہ کمپنی کی ایک لیڈی ٹائپسٹ نے خودکشی کر لی ہے۔ یہ سن کر میرا دِل زور سے دھڑکا، لیکن میں نے خود کو قابو میں کرتے ہوئے اس سے پوچھ بیٹھا......

''کون لیڈی ٹائپسٹ......؟''

چند لوگوں نے ایک ساتھ کہا...... ''مالا!''

مالا، میرے سامنے یہ نام اجنبی نہ تھا جس کو جاننے میں مجھے دیر لگتی۔ پھر ماضی کے اوراق تیزی سے کھلتے چلے گئے......

وہ سچ مچ میری رفیق اور میری ہمراز تھی۔ وہ بحیثیت ٹائپسٹ اس وقت بحال ہوئی تھی جب میں اس کمپنی میں بحیثیت اکاؤنٹس کلرک کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی شیلا بھی بحال ہوئی تھی۔ لیکن وہ میری نظروں سے دور دوسرے سیکشن میں کام کرتی تھی جبکہ مالا میرے ساتھ۔ وہ ایک معمولی شکل وشباہت والی سانولی رنگ کی لڑکی تھی۔ بلکہ اسے لڑکی نہ کہہ کر اگر عورت ہی کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کی عمر تیس سال سے کم نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ غیر شادی شدہ تھی۔ لباس میں

سادگی اور مزاج میں سنجیدگی اس کی نسوانی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ تنہائی اور خاموش پسند ہونے کے باعث اسے بھیڑ یا ہنگاموں سے گھٹن ہوتی تھی۔ شائد اسی وجہ سے وہ بے مقصد کسی بھی اِسٹاف سے فضول گپ شب نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے کافی گھل مل کر باتیں کرتی۔ اکثر میں یہ سوچتا بھی آخر ایسا کیوں......؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ اس پر میرے کچھ احسانات ہیں۔ پہلے پہل جب وہ اِس کمپنی میں آئی تھی تو کئی مواقع پر میں نے اسے ڈھارس دی تھی اور عملی تعاون بھی۔ مثلاً پہلے پہل اس کے ٹائپ شدہ پیپر میں جو غلطیاں رہ جاتی تھیں اسے دُرست کر دیتا تھا یا کسی دِن زیادہ ٹائپ کرنا ہوتا تو میں اس کے کام میں ہاتھ بٹا دیتا تھا۔ وہ کافی محنتی اور اپنے تمام کام کو بحسن وخوبی انجام دیتی تھی۔ فرصت کے اوقات میں، میں اکثر سوچا کرتا ——"اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ وہ کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہے؟" اِس طرح کے بے شمار سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں، میں صرف اسے دیکھتا رہتا، لیکن کچھ کہنے یا پوچھنے کی جسارت نہ کرتا۔ آہستہ آہستہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوتی چلی گئی اور جب بے تکلف ہوگئی تو میں اس کی سوچ وفکر کے بارے میں پوچھ بیٹھا...... ایک بار، دوبار، تین بار...... اور بار بار، مگر اُس نے کبھی بھی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ وہ بہت کم سخن بھی تو تھی۔ میں نے کئی بار مختلف انداز میں مختلف مقامات پر اُسے کریدنے کی سعی کی مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ وہ خوددار تھی۔ شائد اسی لئے اس نے کل کے بعد آج میرا سامنا نہیں کیا۔ اس نے جو کہا، عملاً کر دِکھایا۔ کاش! وہ ایسا نہ کرتی؟

اس کا مکان میرے راستے ہی میں پڑتا تھا، لیکن دفتر جانے میں اس کا ساتھ کبھی نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ میں ہمیشہ کچھ تاخیر سے دفتر پہنچتا تھا جبکہ وہ ہمیشہ وقت پر

پہنچ جاتی۔ البتہ دفتر سے واپسی کے وقت ہم دونوں اکثر ایک ساتھ اپنے اپنے مکان کی جانب واپس لوٹتے۔ اِتفاق سے ایک دِن میں قبل از وقت دفتر کے لئے گھر سے نکل پڑا اور تیز رفتاری سے اپنے قدموں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ ابھی دفتر سے کچھ دور ہی تھا کہ میری نظریں یکا یک آیورویدک ٹانک کی دکان سے اُترتی ہوئی مالا پر پڑیں جو شائد اس دکان سے کچھ خرید کر دفتر کی جانب لپک کر جا رہی تھی۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ کچھ ہی لمحے بعد، میں اس کے قریب تر ہو گیا۔ ساتھ چلتے ہوئے جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اسے کافی حیرت ہوئی اور ساتھ ہی فکر بھی۔ لیکن اپنی عادت کے مطابق کھلی نہیں کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے؟ اور کہاں رُکی تھی؟ کافی اصرار کے باوجود وہ اصلی بات ہضم کر گئی۔ اس دِن میرا موڈ خراب ہو گیا اور پھر اس وقت راستے میں کچھ بات نہیں کیا۔ یہاں تک کہ دفتر میں بھی نہیں۔ حالانکہ اس نے کئی بار مختلف انداز میں میرے ٹیبل کے پاس آکر بات کرنی چاہی۔ میری اِس غیر توجہی اور پُر اسرار خاموشی کو اس نے بھانپ لیا کہ میں اس سے غصہ ہوں۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ قریب کی کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور بولی------

''تم شائد مجھ سے کافی ناراض ہو، لیکن تمہاری خفگی بجا نہیں۔''

''مجھے تمہاری کسی بات سے مطلب نہیں۔'' میں نے غصے میں جواب دیا۔

''مطلب ہے ...... تبھی تو تم مجھ کو بار بار کریدتے ہو، جو میں چھپانا چاہتی ہوں۔'' اس نے میری بات کا دوٹوک جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، مجھ سے ایسی غلطی ہوئی ہوگی، لیکن اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ اِس قسم کی گفتگو کبھی نہیں کروں گا۔'' میں نے تقریباً قسم کھاتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پھر میرے ٹیبل پر جھک کر تقریباً بلبلاتے ہوئے کہنے لگی ------

''راجن! میرا ماضی میری اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں، تم مجھے مزید نہ کریدتے تو زیادہ بہتر تھا۔ لیکن تم محض اس بات کو جاننے کی خاطر مجھ سے خفا ہو بیٹھے۔ اس لئے چند لفظوں میں واضح کر دیتی ہوں کہ جو چیز میں نے آج اس دکان سے خریدی ہے، تم اسے جان گئے ہو۔ ہاں......راجن! وہی شراب، اب میری زندگی ہے اور شائد میرے ماضی کا عنوان بھی۔'' اِتنا کہہ کر وہ نہ صرف اپنے ٹیبل کی طرف چلی گئی بلکہ وہ فرصت سے قبل ہی دفتر سے بھی چلی گئی۔

چند لمحوں تک میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی ہے کیونکہ آپسی نوک جھونک میں اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ وہ کبھی اِس انداز میں مجھ سے ہمکلام نہیں ہوئی تھی۔ شائد میری باتوں سے اس کے اَنا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا تو بہت ہی برا کیا ہے۔ میں کسی کو خوش نہیں کر سکتا تو اُسے مجھے رنجیدہ کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ آخر کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کا ماضی جانوں......؟ یا کسی کا تعاقب کروں۔ اپنے اسی خیالی گتھیوں میں اُلجھا ہوا فرصت کے بعد اس کے مکان کی طرف چل پڑا اور کچھ دیر کی مسافت طے کرنے کے بعد اس کے دروازہ پر پہنچا اور پھر دستک دی۔ دروازہ کُھلا۔ سامنے نائٹی میں ملبوس مالا کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا اُٹھی۔ اس نے میرا ویل کم کیا۔ میں اندر داخل ہوا اور پھر اس نے دروازے کو یونہی لگا دیا۔ مسہری پر بچھے بستر پر میں جا بیٹھا اور کمرے کی چاروں طرف کا معاینہ کرنے لگا۔ اسی دوران جیوں ہی میں نے اپنی نظر دوسری طرف گھمائی تو کیا دیکھتا

ہوں کہ قریب کے ٹیبل پر شراب کی کئی بوتلیں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ مالا اس ٹیبل کے نزدیک ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے سامنے کچھ نمکین اور پھل کے ساتھ شراب کی ایک نئی بوتل اور ایک خالی گلاس رکھ دیا اور پھر مجھ سے بولی-----

''شوق فرمائیے......!'' نفی میں جواب دیتے ہوئے میں حیرت زدہ نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ایک بوتل جس کا نصف حصّہ خالی تھا، اُٹھایا اور پھر ایک گلاس میں اسے اُنڈیل کر ایک پیگ لیا اور مجھ سے بولی-----

''میں بھی اِس سے نفرت کرتی تھی، لیکن آج یہ میری زندگی ہے، کل اسی کے کارن مجھے کسی نے ٹھوکر مار دیا تھا۔''

میں نے پوچھا----- ''کس نے؟''

''ابھی بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر اس نے گلاس کو اُٹھالیا جس میں اب بھی شراب تھی۔ چند گھونٹ پینے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولی------

''میں ایک متوسط گھرانے کی میٹریکولیٹ ہوں، میرا کوئی نہیں تھا۔ دور کے ایک ماما لگتے تھے۔ اس نے میری تمام زمین اپنے قبضے میں لے کر اس کے عوض میری شادی ایک شرابی سے کردی اور پھر...... اور پھر...... وہ نشے میں دُھت ہو چکی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے شراب کی وہ بوتل اُٹھالی جو میرے قریب رکھی گئی تھی۔ اور اسے خالی گلاس میں ڈھال کر پیتے ہوئے دوبارہ بولی------

''میرا جو پتی دیو تھا، اس نے اُس رات کو جب میں نئی نویلی دُلہن بنی بیٹھی تھی، میرے ہاتھوں میں بوتل تھما کر پلانے کو کہا۔ جب میں نے حیرت سے اسے تکا تو اس نے چلا کر مجھ سے بوتل چھین لیا اور پھر......اور پھر وہ پوری بوتل پی کر باہر چلا گیا۔ کیونکہ

اسے ایک شرابی ہمسفر کی ضرورت تھی۔ مجھ جیسی کی نہیں۔''
یہ کہتے ہوئے وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ پھر بول پڑی ــــــ

''راجن! میں صرف نام کی دُلہن بنی اور اب تک ابھاگن رہی۔ میرے من کی آگ اور جسم کی پیاس نہ بجھی، لیکن ...... وہ میرے اور نزدیک ہوگئی اور پھر اُس نے میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے اشاروں سے اپنی خواہش کو ظاہر کر دیا۔ لیکن اس نے جب مجھے خاموش دیکھا تو بڑی معصومیت کے ساتھ بول اُٹھی ــــــ

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم شادی شدہ ہو، لیکن اِس میں حرج ہی کیا ہے؟ تم میرے دوست ہو، تم میری خواہش کا ضرور ہی خیال کرو گے۔''
میری خاموشی قائم رہی جس کا اس کو دھوکا ہوا کہ میں نے حامی بھر لی ہے۔ پھر وہ اپنے آپ سے باہر ہوگئی۔ یکایک اس کے جسم کی حِدّت نے مجھے پاگل بنا دیا اور میرے رگ و پے میں ایک برقی رو دوڑ گئی اور شعوری کوششوں کے باوجود میں خود کو قابو میں نہیں رکھ سکا ......اور پھر جب میں اس کے کمرے سے باہر نکلا تو میری نگاہیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔ چلتے وقت اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی ــــــ

''راجن! میں بہت شرمندہ ہوں اور مجبور بھی۔ میں اب تمہاری اِزدواجی زندگی میں کانٹے نہیں بوؤں گی۔''

ماضی کے کھلتے اوراق اب ختم ہو گئے تھے، اس بے جان جسم کی جانب میری نگاہ ٹِک گئی جو ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ کمپنی کے سارے اسٹاف اس کی آخری رسومات کی تیاری میں مصروف تھے۔ اسی اثناء میں ڈاکیہ نے میرے پاس آکر ایک لفافہ تھما دیا۔ میں نے متعجب ہو کر لفافہ جیسے ہی کھولا ایک سادہ کاغذ دیکھ کر میں بیحد

متحیّر ہوا۔ ایک سفید کاغذ پر مختصر جملوں پر مشتمل تحریر کردہ خط تھا، جس میں لکھا تھا------

''میں برسوں کی پیاسی تھی......اور پیاسی ہی مرنا نہیں چاہتی تھی......مگر اب وہ پیاس بجھ چکی ہے......!!

☆☆☆

(۱) آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ

(۲) پندرہ روزہ ''آواز''، نئی دہلی۔ مورخہ یکم اپریل، ۱۹۸۵ء

تنہا چاند

مکان کی چھت پر لگے بستر پر میں تنہا نیم دراز لیٹا ہوا نیند کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن نیند کوسوں دُور ہے۔ تنہا، ویران اور تھکی آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ آنکھوں کی تلاش جاری ہے............، آج چودھویں کی رات ہے اور اس کی ٹھنڈی اور خوش نما روشنی اندھیروں پر حاوی ہو رہی ہے۔ شائد میرے دِل کے اندھیروں پر بھی۔ میری نگاہیں آسمان پر ٹک گئی ہیں۔ شائد کسی حسین اور زندہ مجسمہ کی تلاش ہے، وہ کیا ہے............، اب میری آنکھیں غور سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھرپور جوان ہے۔ اس کے اَنگ اَنگ سے جوانی پھوٹتی نظر آ رہی ہے۔ اس کا بدن نہایت ہی خوبصورت اور سڈول ہے۔ اس کے جبینِ ناز پر عجیب سی چمک ہے جس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک مل رہی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میری طرح تنہا اور اُداس ہے۔ دوسروں کے لئے اپنا جلوہ بکھیر کر چپ چاپ کہیں جا کر چھپ جائے گا۔ اِدھر میرے ذہنی خیالات کی رَو اور حسین و دلفریب منظر کا ٹکراؤ ایسا گڈ مڈ ہوا کہ میں حال کی تمام تجلیّوں کو بھول گیا۔ اب میری نظر کے سامنے ایک خوفناک منظر مجھے دہلا رہا ہے۔ ہاں! اب میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک دبیز

سرمئی چادر، نامعلوم ہاتھوں کے ذریعے اس کے قریب لائی جا رہی ہے۔ وہ اب مبہوت اسی جگہ معین۔ اس کی گردشیں تمام ہو چکی ہیں۔ شائد اب اس کا مسکن دوسری جگہ منتقل ہونے والا ہے۔ دبیز سرمئی چادر اس کے قریب ہو چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آج اس کی زندگی کا آخری دِن ہے۔ تین دِنوں تک اپنے چاہنے والوں کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنی رہنے کے بعد اب وہ مجبور ہے۔ پھر اس سرمئی چادر سے اسے ڈھک دیا گیا۔ میں مبہوت لیٹا لیٹا ان تمام مناظر کو دیکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی ایسے مناظر دیکھ چکا ہوں۔ آنکھیں نم ہو چکی ہیں اور دِل بے چین۔

ماضی کے دریچوں کے اُس پار اب کئی یک مناظر میری نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ آ رہے ہیں .... ٹیلی ویژن سینٹر کے ٹیلی کاسٹ کے لئے چار اُمیدواروں میں مجھے اناؤنسر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے۔ میں صرف اس لئے منتخب نہیں کیا گیا کہ میری آواز ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے موزوں تھی بلکہ اس لئے بھی کہ میری تحریروں میں روانی اور سلاست موجود تھی۔ شائد میری اسی دوہری صلاحیت و خصوصیت کی بنا پر ڈائریکٹر مجھ سے زیادہ خوش رہتے اور ساتھ ہی مجھ سے قبل والی لیڈی اناؤنسر مس شہناز بھی۔ وہ کالج سے گریجویشن کے بعد ٹیلی ویژن سینٹر سے منسلک ہو گئی تھی کیونکہ اس نے مزید تعلیم کا اِرادہ ترک کر دیا تھا۔ اپنی خواہش اور ٹیلی ویژن سینٹر سے اُنسیت کی خاطر اناؤنسر بن گئی تھی۔ چاند سا خوبصورت چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ، کشادہ پیشانی اور متناسب قد و قامت والی یہ شوخ لڑکی مجھے پہلے ہی دِن نہایت پیاری معلوم ہوئی تھی۔ چہرے پر شوخی کے بھڑکتے نقوش نظر آئے۔ بڑی بڑی سی سیاہ غزالی آنکھیں اس کی ذہانت کی آئینہ دار لگتی تھیں۔ لباس و رکھ رکھاؤ اور نفاست میں وہ ہر لحاظ سے

دوسری لڑکیوں سے منفرد تھی۔

چونکہ ہم لوگوں کا ساتھ ایسا ہو گیا تھا جیسے چولی دامن کا۔ میں روزانہ ٹیلی کاسٹ پروگرام کی فہرست تیار کر کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے صرف نظر ثانی کرالیتا، خواہ اس دِن پروگرام پیش کروں یا نہیں۔ وہ میری تحریری صلاحیت سے کافی مرعوب ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اکثر مجھ سے اِلتجا کرتی کہ آپ کی ڈیوٹی ہو یا نہ ہو، از راہِ کرم آپ روزانہ آیا کریں اور میرے لئے فہرست تیار کر دیا کریں۔ اِس طرح سے وہ مجھ سے کافی گھل مِل گئی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ پروگرام پیش کرتی تب بھی اسے میری موجودگی باعثِ فخر معلوم ہوتی۔ آہستہ آہستہ مجھے بھی اِس قسم کا روگ لگ گیا تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے پروگرام پیش کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ مذاقاً کہتی بھی ——

''لگتا ہے کہ آپ میری عدم موجودگی میں پروگرام نہیں پیش کر سکتے ہیں۔''

تو میں جواباً کہتا کہ...... ''شائد''۔

''شائد کیوں......؟'' وہ پھر پوچھتی۔

''شائد اس لئے کہ پروگرام تو تمہاری عدم موجودگی میں بھی پیش کر دوں گا، لیکن وہ مزہ یا لُطف نہیں آئے گا جو تمہاری موجودگی میں آتا ہے۔''

میرے اِن جملوں پر وہ خوب ہنستی اور ہنسی کے دوران مجھ سے یہ بھی کہتی ——

''لگتا ہے، اب آپ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔......!''

''بالکل نہیں......!۔'' میں جذباتی انداز میں جواب دیتا۔ اس طرح اِس قسم کی خوش گپیوں سے ہم لوگ برابر لُطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔

فلم سے اسے نفرت تھی، لیکن سیر و تفریح اسے بہت پسند تھا۔ وہ ملک

کے بیش تر قابلِ دید مقامات کی سیر کر چکی تھی۔ دریا، ندی اور باغ کی طرف اپنے معمول کے مطابق ضرور جاتی۔ یہاں تک کہ جب ڈیوٹی سے فرصت ملتی تو وہ مجھے بھی ان مقامات کی سیر کراتی۔ اگر میں کسی دِن ان مقامات پر جانے سے کتراتا یا اِنکار کی کوشش کرتا تو کبھی وہ ناراض ہو جاتی اور کبھی کافی سنجیدگی کے ساتھ درسی جملوں سے مجبور کر دیتی کہ ......"ان خوبصورت اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ یہ دَور حسین شئے اور خوبصورت مناظر کے دیدار کا ہے، اِنہیں ضائع نہ کرو، پھر ایسے مواقع نہیں آئیں گے۔ اور اگر آئیں گے بھی تو وہ لطف نہیں آئے گا۔" ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ٹی.وی. سینٹر سے لے کر باہر تک، ہر پل، ہر وقت ہم دونوں قریب قریب رہتے۔ چند مہینوں کی دوستی اِس قدر مضبوط ہوگئی کہ آنے والے وقت کا ہر لمحہ ہمارے گرد خوابوں کا حسین اور سُنہرا جال بُنتا رہا۔ دورانِ ملاقات اس سے ان گنت باہمی عہد و پیان بھی ہوئے۔ میری زندگی کا وہ حسین لمحہ جب اس نے "ویل کم" پارک میں نہایت والہانہ انداز میں میرے سینے سے لگ کر کہا تھا------

"ریاض......! چودھویں کے چاند کی قسم میں تمہاری ہوں، تمہارے سوا میری زندگی میں نہ کوئی آیا ہے اور نہ کبھی آئے گا۔ تمہیں چھوڑ کر میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔"

تب میں نے اس کے نرم و نازک ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے قریب لاتے ہوئے جواب دیا تھا------

"شہناز......! تم میرے حسین خوابوں کی تعبیر ہو اور قدرت کا عطا کردہ وہ خوبصورت انعام ہو جس پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ تمہارا قُرب میری جنت ہے اور تمہاری خوشی میری زندگی۔" اِس طرح اس نے بے قرار ہو کر میری بانہوں میں اپنا سر

چھپا لیا تھا۔

پھر...... یکا یک اس چاند کو گہن لگ گیا۔ تمام کوششیں، دوائیں اور دعائیں بے اثر ثابت ہوئیں۔

اُف......! وہ قیامت خیز منظر...... میں نے دیکھا، اس کی مجبور نگاہیں مجھے ایک ٹک دیکھ رہی ہیں کہ میں مجبور ہوں، بے وفا نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جنبش سی ہوئی، پھر آنکھوں میں عجیب سی چمک اور پھر اس کی تھکی آنکھیں پتھرا گئیں۔ میں مبہوت کھڑا رہا...... میں کچھ نہیں کر سکا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد...... چند ہاتھوں کے ذریعے اس کا جسد خاکی ایک سُرمئی چادر سے ڈھک دیا گیا۔ جو چاند فرشِ زمین پر روشن تھا، وہ کچھ وقفے کے بعد ڈھیروں مٹی تلے چھپا دیا گیا۔

اب مجھے نیند آرہی ہے کیونکہ میری کمزور نگاہیں اب پوری طرح تھک چکی ہیں۔ اِن نگاہوں نے نہ جانے کتنے حسین اور خوفناک مناظر دیکھی ہیں۔ لیکن اب صرف میری نگاہوں میں تشنگی باقی ہے۔ شائد اس لئے جاگتے اور سوتے خوابوں میں بھی ایسے مناظر میرے قریب گھومنے لگتے ہیں۔ اب میری آنکھیں بوجھل ہو چکی ہیں۔ لیکن اب بھی میرے سامنے ایک منظر جو شائد اس پُر درد کہانی کا اختتام ہے، قریب تر ہو رہا ہے۔ ہاں......! اس چودھویں کے چاند کی کہانی یہیں پہ ختم ہوتی ہے۔

☆☆☆
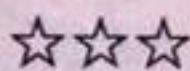
(۱) آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر

(۲) پندرہ روزہ ''آواز''، نئی دہلی۔ مورخہ ۶ ؍اگست ۱۹۸۵ء

کفّارہ

نہ جانے کیسی ہوگی، حسین ہوگی یا بھدّ ی؟...... دُبلی ہوگی، نہیں نہیں گدیلا بدن ہوگا۔ وہ ضرور شرمیلی ہوگی۔ نہ جانے اس کے مزاج کیسے ہوں گے؟ اکرؔم کے دِل میں طرح طرح کے خیالات سوال بن کر اُبھر رہے تھے۔ اس کی طبیعت مچل رہی تھی، جیسے کوئی بچہ دُور سے کھلونے دیکھ کر مچلتا ہو...... وہ کمرے کی طرف بڑھا اور اپنے سامنے پھولوں سے سجی مسہری پر بیٹھی ہوئی دلہن کے قریب جا پہنچا جو سرخ رنگ کے کامدار جوڑے میں ملبوس، ہاتھوں اور پیروں میں رچی ہوئی مہندی کی سیاہی مائل سرخی، پیروں میں بھاری پازیب، ہاتھوں میں انگوٹھیاں اور اس کے ساتھ ہی کنگن، چمکتی ہوئی چوڑیوں کی لمبی قطار اور گھونگھٹ کے ساتھ جھکی ہوئی گردن...... شائد اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

اکرؔم جلد ہی، خیالوں کی پُر کیف دُنیا سے نکل کر خواب کو حقیقت میں بدلنے کی خاطر اس کی جانب بڑھا۔ پھر بڑے ہی پیار سے اس کے رُخ پر پڑے ہوئے نقاب کو اُلٹ دیا۔ ''نہیں...... نہیں......! یہ میری زندگی میں کیسے ہوگیا؟'' وہ گھبرا اُٹھا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی چیخ فضا میں گُم ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ اس کا سارا سُرور ایک ہی جھٹکے میں کافور ہوگیا تھا۔ اس نے بہت مشکل سے اپنے

آپ کو سنبھالا اور سوچنے لگا کہ جس ڈر اور خوف کے ماحول میں خود کو فرار کی راہ اختیار کی تھی وہ اس کا تعاقب کر اپنی گرفت میں لے کر فتح یابی سے سرشار ہے۔ آج وہ خود کو شکست خوردہ محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ زندگی کی راہ میں اپنے مدہوش اور جنونی قدموں سے اُسے روند کر کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ جس کے سامنے اب وہ مجرم کی طرح، جرم اقبال کرنے اور سزا پانے پر مجبور ہو چکا ہے۔

یکا یک اُسے اپنا وہ زرّیں دَور یاد آیا...... جب وہ کالج میں اپنے ہونہار ہونے کی وجہ کر اساتذہ اور دوستوں میں کافی مقبول تھا۔ لڑکیوں میں اِسمارٹ اور حاضر جوابی کی وجہ کر۔ اپنی محنت اور لگن سے ترقی کی منازل آسانی سے طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی ذہانت اور لگن سے یونیورسٹی فیلوشپ بھی حاصل کر لی تھی جس کے باعث پی. جی. کلاس لینے کا بھی اختیار اسے حاصل ہو چکا تھا۔ اپنے کلاس لینے کے طور طریقے سے وہ طلبا میں کافی مقبول ہو چکا تھا۔ اسی درمیان اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ نشاط کے حسن کا خاموش پرستار بن گیا جو اس کی کلاس فیلو بھی تھی۔ بات وہیں تک محدود نہ رہی۔ اس کی چند ملاقاتوں نے اُسے اتنا اس کا گرویدہ بنا دیا تھا کہ اسے جلد سے جلد اپنانے کی دُھن میں نِت نئی ترکیبیں سوچنے لگا۔ آخر اُس نے ایک دِن اس کے ساتھ سیر و تفریح کا کامیاب پروگرام بنا ہی ڈالا۔ شہر کے ایک دوست سے اس کی کار لے کر اس کی جانب نکل پڑا۔ دونوں ایک مقررہ مقام پر ملے۔ تھوری گفتگو کے بعد اُس کار میں بیٹھ کر دونوں سیر و تفریح کے لئے نکل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد اکرم کی کار کافی دُور نکل چکی تھی......

”مجھے ذرا سر میں درد معلوم ہو رہا ہے۔“ نشاط نے کار روکنے کے لئے اکرم

سے کہا۔ اور اکرم نے کار روک دی۔

''میں ذرا سامنے والی دکان سے درد کی ٹکیہ لے کر آتی ہوں۔'' نشاط نے کہا اور وہ کار سے باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اکرم فوراً پہل کرتے ہوئے بول پڑا ـــــ

''ایسا کرو، تم یہیں کار میں بیٹھی رہو، میں دوا لے کر آتا ہوں۔'' اور پھر آناً فاناً دواخانہ سے دوا لے کر واپس آنے پر کار اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے میں آگے بڑھا دی۔ کچھ دُور جانے کے بعد ایک ہوٹل کے پاس اس نے کار روکی۔ وہاں نشاط نے دوا کھائی اور آدھا گلاس پانی پینے کے بعد چائے بھی پی۔ ہلکی پھلکی رسمی گفتگو کے بعد واپس ہاسٹل جانے کا اِرادہ کیا۔ دونوں کار پر سوار ہوئے اور کار دوبارہ چل پڑی۔ ابھی گرلس ہاسٹل چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ نشاط پر نشہ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ نیند میں اونگھتے، اونگھتے کار ہی میں لڑھکنے لگی۔ اکرم نے جلدی سے اپنے ہاسٹل کے گیٹ پر کار روکی اور کار سے نیچے اُتر کر ہاسٹل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ کمرے میں دو لڑکے سوئے ہوئے ہیں۔ اس نے اونگھتے ہوئے چپراسی سے پوچھا ـــــ

''رمن! لڑکے لوگ کہاں گئے؟''

''آپ کو نہیں معلوم! آج کے کلاس کے بعد کل سے دس پندرہ دنوں کے لئے دسہرہ کی چھٹی ہوگئی ہے۔ اس لئے باہر کے سبھی لڑکے آج ہی شام میں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ صرف دو تین لڑکے ہیں جو اندر کمرے میں سو رہے ہیں۔'' پھر رمن بھی گیٹ بند کر کے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ شائد وہ اکرم ہی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اکرم کو اب ایسے ہی ماحول کی ضرورت تھی، اس لئے وہ بہت خوش ہوا اور پھر کار کی طرف گیا جس کے اندر نشاط گہری نیند میں سو رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے گود میں اُٹھا کر

اپنے کمرے میں لے آیا اور بستر پر اسے لٹا دیا۔ آج وہ بہت ہی تھک گیا تھا اس لئے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور انگڑائی لینے لگا۔ اس کے سامنے نشاط چت پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھیں، گورے چٹے گلابی گال، رس بھرے ہونٹ اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمی ہوئی تھیں جو بلب کی تیز روشنی میں چمک رہی تھیں۔ شائد اس کی دی ہوئی نشے کی گولی اب پوری طرح اثر کر چکی تھی۔ اس کے سینے کا نشیب و فراز سانس کی حرکتوں سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ اِس منظر کو دیکھ کر اکرم مدہوشی کے عالم میں اپنے آپ کو بھول گیا اور اس کے قریب تر ہو گیا۔ اب تو اس کے اندر چھپا ہوا اور سویا ہوا مرد بھی جاگ اُٹھا تھا اور پھر وہ ایک لامتناہی حد کو پار کر چکا تھا۔ پھر ایک جھٹکے میں اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے قاتل کو کسی کے قتل کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ تب اس کو اپنے گناہ کی انجام دہی اور پشیمانی کے ایک بڑے خوف کا ایسا دباؤ محسوس ہوا کہ اس نے کالج اور ہاسٹل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راہِ فرار اختیار کی۔

وہ آج یہ سوچنے پہ مجبور تھا ـــــ ''اُف! میں نے یہ کیا کیا......'' اور اس کا ضمیر اسے بری طرح دھتکار رہا تھا۔ اسی درمیان اس کی نگاہیں دُلہن سے ٹکرا گئیں جو سامنے بیٹھی ہوئی اُسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ایک خاص انداز سے اسے اشارہ کیا جو اس کے لئے دعوتِ حسن تھا۔ لیکن اس کی خاموش گویائی سے اسے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ ـــــ

''آؤ......اب اُس گناہ کا کفارہ ادا کر دو۔!''

☆☆☆

گود

آخر وہ آج ایک بڑے طعنے کے باعث بلبلا اُٹھا۔ اُسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں تلے بالکل اندھیرا چھا گیا ہو۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا مذاق ہوا ہے۔ وہ یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ لیکن جب اس کی ماں نے خود اس سے جھگڑے کے دوران اپنے غصّے کی حد سے تجاوز کر کے نہ صرف اُسے بُرا بھلا کہا بلکہ اپنی نفرت کی آگ میں بھُن کر اس کو اپنا سوتیلا بیٹا کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اور نہ جانے کیا کیا باتیں بکتی چلی گئی۔ اسے صرف ایک لفظ سوتیلا بیٹا کے علاوہ کوئی اور بات سننے کا بھی ہوش باقی نہ رہا کیونکہ وہ لفظ اس کے دماغ پر برق گر جانے سے کم نہ تھا۔ کچھ وقفے کے بعد جب وہ اپنے ہوش میں آیا تو یکا یک طیش کے عالم میں اس کمرے سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچا، جہاں اس کے پاپا ایک کرسی پر دراز آنکھیں بند کئے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی زوردار آہٹ پا کر اُنہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اسلم کے سرخ چہرے اور اس کی گیلی آنکھیں دیکھ کر بول پڑے——

"بیٹے......! مجھے ایک مدّت سے جس بات کا خوف تھا، آج وہ معاملہ آ ہی گیا۔

میری بھی کیا زندگی ہے کہ ایک بڑے خوف کے سائے میں جیتا رہا۔ اپنی ایک خواہش کے تحت گذری ہوئی آدھی عمر میں ایک پھول جو میرے گلشن میں کھلا ہے، کہیں وہ دو دھاروں کے درمیان فنا نہ ہو جائے۔ بیٹے یہ صحیح ہے کہ وہ تیری سگی ماں نہیں ہے، لیکن تجھے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا ہے۔ اس کی باتوں کا تو بُرا نہ مان، اور نہ ہی اِسے سنجیدگی سے سوچ۔ یہ بات اس نے صرف غصّے کی حالت میں کہہ ڈالی ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تُو غصہ میں کوئی ایسا قدم نہ اُٹھا جس کے باعث یہ گھر برباد ہو جائے۔ تُو تو جانتا ہی ہے کہ میرے گھر کا اِکلوتا وارث صرف تُو ہی ہے، تیرے سوا ہم لوگوں کا کوئی اور تو نہیں۔''

''یہ سب ٹھیک ہے پاپا، لیکن اصلیت کیا ہے؟ اور مجھے جنم دینے والی ماں کون تھی؟ یہ تو آپ کو آج بتانا ہی ہوگا۔'' اسلم جذباتی رَو میں بولنے لگا۔

''بیٹے......! اِن فضول باتوں میں تم اپنا دِل و دماغ مت خراب کرو، جاؤ آرام کرو۔'' پاپا نے اسے مزید سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اسلم یہ جان گیا کہ پاپا اصل بات بتانا نہیں چاہتے ہیں۔ اپنی بے چینی اور تجسس کی کیفیت میں وہ اپنے کمرے میں جا کر مسہری پر اوندھے لیٹ گیا، جہاں نت نئے خیالوں اور اُلجھنوں میں وہ اُلجھتا جا رہا تھا کہ اسی دوران بغل والے کمرے سے پاپا اور اس کی سوتیلی ماں کی نوک جھونک اور بڑبڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں جس سے اس کو اندازہ ہوا کہ اس کی اصل ماں 'منہروا' نامی بستی کی رہنے والی تھی جہاں سے کچھ دُور پر واقع دوسری بستی میں اس کے پاپا کا آبائی گاؤں تھا۔ وہ سوچ اور خیالوں کی پرواز سے اپنی منزل پر پہنچنے کی سعی لاحاصل کرتا رہا۔ اور اسی کشمکش اور اضطراب آمیز سکوں میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کے واقعہ کی خبر بغل کے پڑوسیوں کو اُسی وقت مل چکی تھی۔ جن میں سے ایک دو شخص نے موقع پا کر اسلم کو اس کے بیتے ہوئے ان سارے واقعات جس میں اس کی اصل ماں کی بات بھی شامل تھی، بتادی۔ جسے سن کر وہ بُری طرح بپھر گیا اور وہ لفظ جسے سن کر رات میں بوکھلا گیا تھا، دوبارہ اس کے دماغ میں گھوم گیا۔ وہ بدحواس سڑک کی جانب چل پڑا۔ کیونکہ اس کے ذہن پر صرف یہی فکر جم چکی تھی کہ 'منہروا' بستی اسے جانا ہے اور اس منزل پر جلد پہنچنا ہے۔

اس کی بس تیز رفتاری سے چل رہی تھی، لیکن اسے پھر بھی یہ احساس ہو رہا تھا کہ بس دھیمی رفتار سے چل رہی ہے۔ وہ بس کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اپنی منزل کی راہ کو تک رہا تھا۔ جب اس کی بس شہر سے کافی دُور نکلتی ہوئے بستی سے گزرتے ہوئے اپنے اِسٹاپ پر رکی، تب اسے اتر کر کچھ دُور پر واقع ایک چھوٹا سا مدرسہ نظر آیا جہاں سے اس کی منزل کو راستہ جاتا تھا۔ مدرسہ پہنچتے ہی وہاں موجود ایک ضعیف شخص سے اس کی ملاقات ہوئی اور پھر رسمی گفتگو کے بعد جیوں ہی اس بستی میں رہنے والی عورت 'مریم' کی بابت پوچھا تو اُنہوں نے پہلے اسے گھورتے ہوئے اس پر ایک ٹکٹکی نظر ڈالی اور پھر پوچھ بیٹھے ـــــــ

''بیٹے ...... !تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟''

اُس نے جواباً کہا ـــــــ ''آپ یہ نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ آپ صرف یہ بتانے کی زحمت کریں کہ مریم نامی عورت جو اِس بستی کی رہنے والی ہیں، کیا وہ اب بھی یہیں رہتی ہیں ......؟''

اُس ضعیف شخص نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے صرف اِتنا کہا ـــــــ

’’بیٹے ......! تم پہلے شخص ہو جو گزشتہ تیس برسوں کے بعد کوئی اس کی کھوج خبر لینے آیا ہے۔ ہاں! پہلے جب میں یہاں مدرس تھا تب اس کی کھوج خبر لینے والوں میں اس بدنصیب کا باپ جو میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ مدرسہ سے چھٹی کے بعد ذرا تاخیر ہو جانے پر آتا تھا۔ اس کی کم عمری میں ہی اس کا باپ تپ دِق جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اس کی سرپرستی سے سبکدوش ہو گیا۔ پھر اس کی ماں سرپرست ہوئی۔ ساتھ ہی میں گنہگار بھی۔ میں اپنے آپ کو اس کے لئے گنہگار کہتا ہوں کیونکہ میں ایک سرپرست ہونے کے ناتے اس کی شادی کرانے میں پیش پیش تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ انوار عالم جس کے خاندان سے میں واقف تھا، اِتنا کم ظرف اور خودغرض انسان ہوگا۔ اس نے خود اس سے شادی کی تجویز رکھی تھی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھا۔ اپنی بانجھ بیوی سے نااُمید ہو کر مجھ سے بڑی معصومیت کے ساتھ اولاد کی خواہش کے تئیں دوسری شادی کو بھی نبھانے کا اِس ڈھنگ سے وعدہ کیا کہ میں اس کی باتوں میں آگیا اور پھر میں نے اس کے بار بار اصرار کرنے پر کافی غور وخوص کے بعد اس بدنصیب لڑکی کی شادی اس سے کرادی۔ شادی کے سال بھر تک اس نے بڑے مزے سے ہنسی خوشی کی زندگی بسر کی، لیکن جب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی تب اسے ایک دو ماہ قبل شہر لے گیا جہاں اس کی پہلی بیوی رہا کرتی تھی۔ وہاں اس نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا۔ اس بچّے کی پیدائش کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی مائیکا پہنچانے کے بہانے اسے یہاں چھوڑ گیا۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی پلٹ کر دیکھنے تک کو نہیں آیا۔ بچہ وہیں اس کی سوتن کے پاس تھا۔ جب وہ اپنے میکے آرہی تھی تو اس نے ایک فریب زدہ بہانہ سے اس بچہ کو روک لیا تھا کہ یہ بھی تو اس کی ماں ہی ہے۔ تم دونوں سوت تھوڑے ہی ہو۔ سوت کا معاملہ تو وہاں آتا ہے جب دونوں

کی اولادیں ہوں۔ یہ تو تمہاری اور اس کی دونوں کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس طرح اس نے سمجھاتے ہوئے دلاسہ دیا کہ وہ معصوم اور سیدھی سادی لڑکی اس کی باتوں میں آ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ماں نے کئی بار اس سلسلے میں اپنے داماد کو سمجھانے اور اپنے گھر اسے لے جانے کی منت کرتی رہی، اس کے معصوم بچہ کا بھی واسطہ دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شائد وہ اپنی پہلی بیوی کے کہنے پر اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا عہد پہلے ہی کر چکا تھا۔ کیونکہ اس کی جو سب سے بڑی آرزو اولاد کی تھی، وہ تو اب پوری ہو چکی تھی۔ اس کی بانجھ بیوی جو کماؤ عورت تھی، اس کی مرضی کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا تھا۔ ہمارے کہنے اور سننے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب میں نے غصے میں اسے قانونی دھمکی دی تو اس نے رقم کے عوض چھٹکارا پانے کی بات کہہ دی جس کو سن کر اس بدنصیب عورت پر کیا گزری ہوگی یہ تو میں نہیں جانتا البتہ وہ بچہ کے بغیر کیسے تڑپتی رہی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔'' اِتنا کہتے کہتے اُس ضعیف آدمی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ تب اسلم اس ضعیف آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کافی سمجھانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس ضعیف آدمی نے خود پر پوری طرح قابو پا لیا تب اس نے پھر سوال کیا------

''بیٹے......! میں نے اس بدنصیب عورت کا واقعہ تمہارے پوچھنے پر جذبات کی رو میں سنا دیا، لیکن کیا تم اب بھی یہ نہیں بتا سکتے ہو کہ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ تم اس کے کوئی رِشتہ دار ہو جسے میں نہیں جانتا ہوں؟''

اسلم کی خاموشی اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اُنہوں نے اندازاً کہا ------

''کیا تم اس کے وہ بیٹے تو نہیں جس کی پیدائش سے کچھ مہینے بعد وہ بدنصیب

ماں اپنے بیٹے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکی۔'' اتنا کہنا ہی تھا کہ اسلم اس ضعیف آدمی سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور پھر سسکتے ہوئے کہنے لگا------

''بابا......! میں وہی بدنصیب اولاد ہوں جس کی پیدائش کے بعد میری اُس ماں کا یہ حشر ہوا۔ یہ میری بدبختی نہیں تو اور کیا ہے کہ مجھے جنم دینے والی ماں میری لمبی جدائی میں تڑپتی رہی اور میں قیمتی اور خوبصورت پالنوں میں جھولتا رہا۔ اور اُس عورت کی گود میں پرورش پائی جس نے میری ایک معمولی خطا پر آج اتنا بڑا طعنہ دے دیا کہ میں تو اُس کا سوتیلا بیٹا ہوں۔ کاش! میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس ضعیف شخص نے اسلم کو دلاسہ دیا اور پھر کچھ دیر کے بعد اسے اپنے ساتھ لے کر اس منزل کی طرف چل پڑے جس کی راہ وہ عورت ایک مدّت سے دیکھتے دیکھتے تھک چکی تھی۔ اپنے پھول سے بیٹے کے دیدار کو ترس گئی تھی اور اس کی جدائی میں روتے روتے اس کی آنکھیں نہ صرف سوج گئی تھیں بلکہ بینائی کی تیز روشنی بھی اب ڈھلنے کے قریب تھی۔

اسلم اور وہ ضعیف آدمی وہاں سے ایک میل کی دوری طے کرنے کے بعد جب ایک ٹوٹے پھوٹے کچے مکان میں داخل ہوئے تو ایک کوٹھری میں پلنگ پر لیٹی ہوئی ایک عورت جسے دو عورتیں اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھیں، ان لوگوں کو دیکھ کر الگ ہو گئیں۔ اور اندر داخل ہو کر اس ضعیف آدمی نے آواز دی------

''مریم بیٹی......! میں ہوں تمہارا علیم چچا۔''

یہ سنتے ہی اس عورت نے اپنی بند آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے کہا------''ہوں۔''

اس ضعیف آدمی نے پھر کہا------''دیکھو تو مریم کون آیا ہے؟''

یہ سنتے ہی اس کی دھیمی آواز گونجی------''کون آیا ہے؟'' اُنہوں نے دوبارہ کہا------

''دیکھو تو سہی ......!''

یہ سن کر وہ کچھ چونکی اور اٹھ کر اس نے اپنی آنکھوں کی مدھم ہوتی ہوئی روشنی سے اپنے پاس بیٹھے ہوئے اسلم پر نظر کی ۔ اور پھر اسے چھوتے ہوئے بے اختیار اپنی باہیں پھیلا دی اور ''میرا بابو''، کہہ کر چلا اُٹھی ۔ اِتنا سننا تھا کہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسلم بھی ''اماں'' کہتے ہوئے اس سے اِس طرح لپٹ گیا جیسے کوئی خوف سے سہما ہوا بچہ اپنی ماں کی گود میں پناہ لیتا ہے ۔!

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

جھک گیا آسمان

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سرکاری کام سے من بھاون چک نامی ایک گاؤں میں گیا تھا۔ محکمہ کے ذریعے کرائی گئی مردم شماری کا از سر نو جائزہ لینے کی غرض سے تمام گاؤں اور قصبوں میں اِسٹاف کو بھیجا گیا تھا۔ ان میں ایک میں بھی سپروائزر کی حیثیت سے گیا تھا۔ چونکہ میں سرکاری کام سے اُس گاؤں میں بھیجا گیا تھا اس لئے مجھے وہاں کے مکھیا کے یہاں ہی ٹھہرنا پڑا تھا۔ میں ہر روز اُس گاؤں کے گردونواح کا چکر لگاتا اور کاغذات کے مطابق مردم شماری کی تصدیق کرتا۔ اور پھر شام کو مکھیا کے گھر پر لوٹ آتا تھا۔ اس کے بعد مکھیا جی اور سرپنچ جی جو اُس مکان سے کچھ دوری پر رہتے تھے، وہ بھی وہاں آجاتے۔ پہلے کچھ دیر تک صلاح ومشورہ ہوتا پھر ضروری مسائل کے بعد خوش گپیّوں کا سلسلہ شروع ہوتا جو دیر رات تک چلتا رہتا۔

حسبِ معمول اُس دِن بھی میں شام کو سرکاری کام نپٹا کر مکھیا جی کے بنگلہ پر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں کچھ گہما گہمی نظر آئی۔ میں کسی سے کچھ پوچھے بغیر بنگہ کی طرف تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کہیں آس پاس شائد کوئی حادثہ

ہوا ہے۔ میرا یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب مکھیا جی کے بنگلہ پر مکھیا جی اور سرپنچ جی دونوں کو غیر حاضر پایا۔ وہاں صرف گاؤں کا چوکیدار تھا نظر آیا جو ایک کنارے بیٹھا ہوا کھینی بنانے میں مگن تھا۔ مجھے بنگلہ کی طرف آتے ہوئے دیکھ کر یکا یک وہ اُٹھ کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور پھر فوراً کمرہ سے پلنگ لے آیا۔ میں ہاتھ مُنہ دھو کر فارغ ہوا تب اس نے بستر لگا دیا۔ میں جیسے ہی پلنگ پر آرام سے بیٹھ کر اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بول اُٹھا------

''مالک! ابھی تھوڑا دیر بھئیل، مکھیا جی، سرپنچ جی کے گھر گئیل بارن۔''

میں نے تعجب سے پوچھا----''سرپنچ جی کے یہاں......؟''

اس نے کہا----''ہاں سر......! ان ہی کے یہاں۔''

''کیا کوئی بات ہے؟'' میں نے اس سے پھر پوچھا۔

''کا کہیں سر......! ان کے گھر تو بڑا انرتھ ہو گئیل۔''

''کیا ہوا......؟'' میں نے جب اس سے دوبارہ دریافت کیا تو وہ بڑے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں بتانے لگا------

''ای گاؤں میں شادی بیاہ کے عجب رواج با خاص کر بڑکن اور پیسہ والن کے۔''

اس کے آگے وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مکھیا جی کے لڑکا کو بنگلہ کی طرف آتا ہوا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ سنیل سنگھ جو مکھیا کا بڑا لڑکا تھا، تیز قدموں سے لپک کر گھر کی طرف چلا آرہا تھا۔ شائد وہ سرپنچ جی کے یہاں سے آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا رُکا اور پرنام کر کے کمرہ کے اندر جانا چاہا، لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کے تمتمائے ہوئے چہرہ اور غصہ سے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر مجھ کو اندازہ ہوا کہ ہو نہ ہو سرپنچ جی اور کسی

پڑوسی میں جھگڑا ہوا ہے یا پھر اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی درمیان اس نے تھوّ کو پانی اور چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ کمرہ کے اندر چلا گیا۔ تبھی وہ میری طرف رُخ کرتے ہوئے بولا ــــــ

''جانتے ہیں سر! آج کتنا بڑا انرتھ ہو گیا۔ میں بار بار پتا جی اور گاؤں کے اپنی ذات برادری کے لوگوں کو منع کرتا تھا کہ یہ رواج بند کرو۔ لیکن میری کون سنتا ہے۔ آج سمجھ میں آ گیا نہ؟...... کہ یہ کتنا گندہ اور جاہل لوگوں کا رواج ہے۔ آج سنسار کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے مگر کچھ جاہلوں کے ساتھ پڑھے لکھے لوگ بھی اڑیل ٹٹو کی طرح اڑے ہوئے ہیں۔ ارے شادی بیاہ کی بات ہے، زندگی بھر کا سودا ہے، خوشی کا سودا ہے۔ اس میں زور زبردستی اور یہ اپہرن وِواہ۔!'' اتنا کہہ کر وہ یکا یک خاموش ہو گیا۔ اس کی سنجیدگی سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایسے رواجوں کا شدید مخالف ہے۔ ''اُپہرن وِواہ'' یعنی اغوا کئے گئے لڑکے کی شادی۔ ایسی بات میں نے بہت پہلے بھی سنی تھی۔ میں ایک بار اپنے محلّہ سے بارات میں ایک گاؤں گیا تھا جہاں بڑے بزرگ لوگوں نے جوان لڑکوں کو گاؤں میں اِدھر اُدھر گھومنے کے لئے سختی سے منع کیا تھا کہ پتہ نہیں کس جگہ کون لڑکے کا اغوا ہو جائے اور پھر زبردستی اس کی شادی کر دی جائے۔ ان باتوں کی روشنی میں میرا ذہن گزری ہوئی باتوں کی طرف جست کر گیا۔ یکا یک مجھے پاس ہی بیٹھے سنیل کی خاموشی کا خیال آیا اور میں فوراً بول پڑا ــــــ

''کیا سرپنچ جی کے یہاں ایسی ہی شادی ہوئی ہے......؟''

اس نے کہا ــــــ ''شادی ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ گھور انرتھ ہو گیا ہے۔'' اِس درمیان تھوّ پانی اور چائے لے آیا تھا۔ ہم دونوں پانی پی کر چائے پینے لگے۔ میں نے چائے کی چسکی

کے دوران سوچا، ایسے حالات میں مجھے سرپنچ جی کے یہاں جانا چاہئے۔ چائے ختم کر میں نے سنیل سے کہا------

''سنیل بابو...... کیوں نہ ہم لوگ سرپنچ جی کے یہاں چلیں۔''

اس نے فوراً جواب دیتے ہوئے مجھ سے کہا------

''نہیں......نہیں...... میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ آپ اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں کے یہاں نہیں جانا ہے جس نے اپنا دھرم نشٹ کر دیا ہو۔''

''بھئی...... ہمارے ساتھ چلیں۔'' میں نے سنیل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ہمارے کہنے پر وہ راضی ہوا، لیکن اس کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ راہ چلتے ہی غصہ کے لہجے میں مجھ سے گویا ہوا------

''جانتے ہیں، یہ سب کیسے ہوا......؟ کل وہ سامنے والے میدان میں'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا، بغل والے گاؤں سے فٹ بال میچ تھا۔ اس میں اس گاؤں کے مکھیا نریش سنگھ کا لڑکا دنیش سنگھ بھی کھیلنے والا تھا جس کی خبر سرپنچ جی کے خاص نوکر کو تھی۔ بس کیا تھا، کچھ دوستوں اور سرپنچ جی کے پروگرام کے مطابق میچ کے فوراً بعد اس گاؤں کی ٹیم کے اس کھلاڑی کا اغوا کر لیا گیا تا کہ اس سے سرپنچ جی کی بیٹی کی شادی ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی، لیکن جیوں ہی شادی کے لئے دونوں کا ساتواں پھیرا پورا ہوا اور دھرم کے مطابق سیندور کی رسم کے بعد کنیا دان کا وقت آیا عین اسی وقت جب ڈومن دوسادھ کو خبر ملی کہ اس کے بھانجہ سے سرپنچ جی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے تو وہ دوڑا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے بولا------

''سرپنچ جی......! یہ شادی روک دیجئے، یہ لڑکا دنیش سنگھ نہیں، یہ تو میرا بھانجہ

دیوا کر پاسوان ہے۔"

یہ سنتے ہی سرپنچ جی اور وہاں موجود تمام لوگوں کے ہوش اُڑ گئے۔ اور سنیل کی تفصیلی بات ختم ہوتے ہوتے ہم لوگ سرپنچ جی کے یہاں پہنچ چکے تھے جہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ مکھیا جی اور سرپنچ جی دوسرے اہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو سمجھا بجھا رہے تھے۔ مگر سرپنچ جی اِس شادی کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔ پنڈت جی الگ پس وپیش میں تھے کہ وہ کیا کہیں! حالانکہ وہ دھرم شاشتر کے مطابق شادی کی رَسم پوری کر چکے تھے۔ اسی اثنا میں چیختی چلاتی ہوئی سرپنچ جی کی وہی بیٹی سارے لوگوں کے درمیان آگئی اور دیوار سے لٹکی ہوئی بندوق اُٹھا کر بولنے لگی......

"پتا جی......! اگر آپ راجپوت ہیں تو میں بھی آپ ہی کی سنتان ہوں جس کا دھرم وچن نبھانا ہے۔ میں نے دھرم کے انوسار ساتوں پھیرے لئے ہیں اور اگنی کے سمکچھ جنم جنم کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے تو اسے مرتے دم تک نبھاؤں گی۔" وہ ایک ہی سانس میں ساری باتیں بول گئی۔

سرپنچ جی اپنی اکلوتی بیٹی کے خوفناک تیور دیکھ کر بوکھلا گئے۔ گھبراہٹ میں ہمیشہ اونچا رہنے والا اُن کا سر آج لوگوں کے سامنے ایسے جھکا تھا جیسے پورا آسمان جھک گیا ہو۔!!

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

اپنا دُکھ

ہر طرف شور برپا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جانوروں اور اِنسانوں کی چیخ و پکار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ غنڈے موالی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ کھیتوں میں لہلہاتے ہوئے پودے لوگوں کی بھاگ دوڑ میں روندے چلے جارہے تھے۔ اناج لکڑیوں کی طرح جل کر خاک ہورہا تھا۔ بوڑھے، جوان اور معصوم درندوں کے ہتھیار سے اِس طرح ذبح ہورہے تھے جیسے قصاب کے ہاتھوں جانور ہوتا ہے۔

شبنم فساد کی گھبراہٹ میں بوکھلا رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ کبھی وہ اپنے بوڑھے باپ کے کھوج میں کھڑکی سے باہر سے جھانک کر دیکھتی، تو کبھی دروازے کے سوراخ سے۔ پھر اُس کے دِل میں خیال آیا کہ ابا تو کہیں چھپ ہی گئے ہوں گے، میں بھی پیچھے والے پوال کے ڈھیروں میں چھپ جاؤں! لیکن پھر یہ سوچتی کہ کہیں باہر گئے تو دشمن مار ڈالیں گے۔ اپنی بے بسی کے عالم میں وہ کانپ ہی رہی

تھی کہ اچانک پیچھے والی دیوار سے کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ پلٹ کر جو اُس نے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے پڑوسی رگھو کا بیٹا رمن کھڑا تھا جسے دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی جان نکلتے نکلتے بچ گئی ہو کیونکہ وہ اُسے اپنا بھائی جیسا سمجھتی تھی۔ وہ کئی سال سے اس کی کلائی پر راکھی باندھتی آرہی تھی۔ اِس وجہ کر اسے اپنا بھائی اور مددگار سمجھ کر پورے اطمینان کے ساتھ اس سے پوچھا——

''رمن بھیا......تو کدھر سے آوت ہو؟ ہمار ابا کہنے گئیل......؟''

''جہنم میں......اور تُو بھی......!'' رمن تیور بدلتے ہوئے بولا۔

شبنم بالکل گھبرا گئی اور یہ سمجھ گئی کہ یہ بھی آج میرا دشمن ہوگیا ہے۔ اس کا جسم پھر سے کانپنے لگا۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ خوف سے رو رو کر اُس سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

''رمن بھیا......! ہمرا کے تُو چھوڑ دے، تُو تو ہمار بھائی۔ دیکھ ہم تورا راکھی بندھنی، تُو آدمی کے بھیس میں شیطان نہ بن بھائی، ہمار رَکچھا کر۔''

''سار تُو ہمار بہین کیئسن رے۔ گھبراوا نئی کھے تورا کھاترا اِتنا جرور کریم کی ہمار سے بادوسر کوئی ہاتھ نہ لگائی۔ چل جھٹ سے آ، نہ تو تُو ہمرا جانے لاٹو کہ ہم ایک نمبر کے حرامی با۔'' وہ اپنے رنگ میں دھونس جماتے ہوئے بولا۔

شبنم ایک طرف کونے میں سکڑی کھڑی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اور اُدھر وہ درندگی پر پوری طرح آمادہ ہو چکا تھا۔ اس کی طرف زور سے لپک کر اس کے پلّو کو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ ساڑی تار تار ہوگئی۔ مجبور ہوکر شبنم اپنی حفاظت کی خاطر شیرنی کی طرح پاس میں پڑی لکڑی سے اس پر حملہ کرنے لگی۔ کیونکہ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ اب میں نہیں بچ سکوں

گی۔ اس لئے مر مٹنے پر اُتر آئی۔

رمن اُس پر اِس طرح ٹوٹ پڑا جیسے کوئی بھوکا کتا چھچھڑے پر...... مزاحمت کے باوجود وہ اُس کی گرفت میں چلی گئی۔ اس کے باوجود مزاحمت جاری رہی۔ شبنم نے اپنی پوری قوتوں کو یکجا کیا اور ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس کی گرفت سے الگ ہو گئی اور بُری طرح ہانپنے لگی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے۔ رمن پھر اس کی طرف موقع پا کر ٹوٹ پڑا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے پیچھے کی طرف موڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے بلاؤز کو نوچنا ہی چاہ رہا تھا کہ گرفت ڈھیلی ہونے کے باعث ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ شبنم نے اُلٹے ہاتھ سے ایک بھرپور طمانچہ دے مارا اور ڈھکیلنے پر وہ پیچھے کی طرف ہو گیا۔ وہ پوری طرح سمجھ چکی تھی کہ اب میں نہیں بچ سکتی کیونکہ باہر بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ موت کی گھبراہٹ اور پھر اپنے لٹنے کا غم...... وہ کافی نروس ہو گئی اور اس کا سارا جسم تھرّانے لگا۔ رمن فتحیابی کی مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان سے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ یہ جان چکا تھا کہ وہ اب بالکل تھک چکی ہے۔ اُدھر شبنم اپنے کو بچانے کی غرض سے پیچھے کی طرف سرکنے لگی، لیکن کہاں تک......؟ آخر اس کی کھسکتی ہوئی ٹانگ کنویں میں غڑاپ سے لے گئی۔ رمن نے اپنی ناکامی پر غصّے کی حالت میں اپنے دانتوں کو پیستا ہوا دروازے کو ایک ہی جھٹکے میں کھولا...... اور بالکل حیران سا ہو گیا کیونکہ اس کی نظر ایک ایسی صورت پر جا ٹکی جسے دیکھ کر سر شرم سے جھک گیا...... رینو! سامنے والے پوال کے ڈھیروں پر بالکل برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر صرف تہبند، وہ بھی برائے نام تھا۔ بلاؤز اور اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ندارد۔ آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو، گالوں پر بے شمار دانتوں کے نشانات تھے۔ جسم کی ایسی حالت جیسے کسی نوخیز کلی کو

بے دردی سے مسل دیا گیا ہو۔ وہ اپنی سگی بہن کی ایسی دُرگت دیکھ کر غصہ سے کانپ اُٹھا لیکن اس کی نظر کے سامنے یکا یک شبنم کا چہرہ گھومنے لگا جو کنویں کے گہرے پانی میں لقمۂ اجل بن گئی تھی۔

بستی میں اب بھی ہر طرف شور برپا تھا، لیکن اس کے کان جیسے بند ہو گئے تھے۔ اُسے کچھ بھی نہیں سنائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی ذلیل و گھناؤنی حرکت اور مردہ بہن کی لٹی عصمت کے غم میں اِس طرح کھو گیا تھا کہ وجود اور عدم وجود میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆
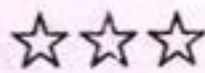
ڈوبتی کشتی

مجھے شبنم کا بچپن آج بھی یاد ہے...... ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ وہ ننھی سی، پیاری سی، چلبلی لڑکی، جو نہ صرف میری چھوٹی بہن تھی بلکہ میرے لئے ایک کھلونا بھی تھی۔ جس کے ہمراہ میں اکثر وبیشتر کھیلتا اور خوش ہوتا تھا۔ ہم لوگ کا بچپن بڑے خوشگوار ماحول میں گزرا۔ جب میں میٹریکولیشن مکمل کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوا تو وہ دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ وہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی میرے مشورہ کے بغیر کچھ نہ کرتی۔ اس کے مزاج میں میل ملاپ، اپنا پن اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ہم لوگوں میں کبھی کسی بات پہ کوئی جھگڑا یا تکرار نہیں ہوا۔ میٹریکولیشن کے بعد اسے کالج میں داخلہ کرانے کا پروگرام بن ہی رہا تھا کہ والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح اس کے کالج کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوکر رہ گیا۔ مجھے والد کی جگہ کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔

اب شبنم بڑی ہو چکی تھی۔ اس لئے امّی نے اس کے کالج کی تعلیم کو غیر مناسب کہا۔ لیکن میں نے اسے Distance Education کے تحت آئی۔اے۔ میں

باضابطہ داخلہ دلا دیا تا کہ اس کا خالی پن دُور ہو سکے اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہو سکے۔ انٹر مکمل ہونے کے بعد امّی نے اس کی شادی کی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ چنانچہ رِشتہ کے لئے تگ ودو شروع کر دی گئی۔ موجودہ زمانہ کے حالات کے تحت رِشتہ طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا پھر بھی کوششیں جاری رہیں۔ جب بھی کوئی رِشتہ آتا تو پہلے اس کی شادی کی بات کی جاتی جو اُسے قبول نہیں تھا۔ کیونکہ اُسے پہلے اپنی بہن کی شادی کرنی تھی جو ہر لحاظ سے ضروری تھا۔ کئی رِشتے آئے جو نا قابلِ برداشت شرائط کے تحت رکاوٹ بنتی رہی۔ اسی درمیان ایک جگہ سے گولٹ رِشتہ کا پیغام آیا جسے سن کر امی نے حامی بھرتے ہوئے مجھ سے کہا-----

"تم دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے قریب رہنا پسند کرتے ہو اس لئے یہ رشتہ بہتر ہوگا۔"

اس نے سوچا کہ ویسے بھی شبنم کی رُخصتی کے بعد گھر بالکل اکیلا ہو جائے گا، آج نہ تو کل، مجھے بھی شادی کرنی ہی ہے اس لئے ایک ساتھ شادی ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے؟
اسی درمیان امی پھر بول اُٹھیں-----

"ہم تو کہتے ہیں کہ یہ رِشتہ اللہ میاں نے بھیجا ہے، بیٹا...... اسے طے کر لو اور اپنی منظوری دے دو۔"

حالات اور وقت کے تقاضہ کے تحت اس رشتہ کو منظوری دے دی گئی۔ چونکہ اس گھر کی یہ پہلی اور آخری دونوں شادیاں ایک ساتھ ہو رہی تھیں اس لئے اپنے ارمانوں کو پورا کرنے کی کوئی بھی کسر نہ چھوڑی گئی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلے شبنم کی شادی انجام پائی وہ دِن...... کتنا خوشگوار ماحول تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے جہاں کی خوشیاں اس کے گھر

میں سمٹ کر آ گئی ہوں۔ مہمانوں کا ہجوم، شادیانے بجنے کی دلفریب آوازیں، ہر طرف چہل پہل، بارات کے خوش آمدید کے لئے دِن بھر کی تیاریاں رات کو دیکھنے کے لائق تھیں۔ وہ بجلی کے قمقمے ......، غرض کہ پورا گھر ڈیکوریشن میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے تمام ارمانوں کو پورا کر رہا تھا۔ کیونکہ شبنم اس کی اکلوتی بہن تھی، جسے وہ بے حد پیار کرتا تھا اور اپنی شفقت اس پر نچھاور کرنا، اپنا مقدر سمجھتا تھا۔

بارات آئی ...... کچھ دیر کے بعد نکاح ہوا۔ نکاح کی منظوری مل جانے کے بعد اس کی چہیتی بہن شبنم پرائی ہو چکی تھی۔ وہ اب دوسرے گھر کی ہو گئی تھی۔ اس کی نظروں سے وہ اب دُور رہے گی، یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور سماج کا رواج، جس میں فرض کی ادائیگی کی خوشی بھی ہے اور جدائی کا غم بھی شامل ہے۔ صبح کو جب رُخصتی ہونے لگی تو شبنم بہت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور اس کے ساتھ وہ بھی کتنا رویا تھا۔ اس کی پیاری بہن شبنم اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

چوتھے دِن فیاض کی بارات گئی۔ نکاح اور دوسرے رسوم کے بعد اس کی نظر شبنم پر پڑی جس کا ولیمہ اسی دِن تھا۔ وہ شادی کے جوڑے میں بے حد حسین اور خوش نظر آ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوا تھا، یہ لطیف احساس جب بھی اس کے ذہن میں آتا تو اسے کافی فرحت محسوس ہوتی جو چین اور سکون کا ضامن ہے۔ شادی کے ایک ماہ تک دونوں اطراف سے خوشیوں کا سلسلہ بنا رہا۔ پھر یکا یک شبنم کے شوہر کی بے اعتنائی کی خبریں ملنے لگیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دِن بہ دِن بڑھتا چلا گیا۔ وہ بار ہا کوشش کرتا رہا کہ دونوں کے رِشتے اُستوار ہوں اور خوشگوار بنیں۔ اِس کوشش میں اس نے بہت

روپئے بھی اُس پر صرف کر ڈالے۔ لیکن اس کے شوہر کی من مانی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اِس طرح دونوں میں خلیج پیدا ہو گئی۔ لیکن میرے کافی سمجھانے پر شبنم نے اس خلیج کو پاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی پر اس کے شوہر کا ذہن تو پہلے ہی سے کہیں اور لگا ہوا تھا جس کے باعث علیٰحدگی ایک خطرناک صورت اختیار کر گئی۔

فیاضؔ اپنی بہن کی خواندگی زندگی سے بے حد متفکر رہتا تھا اور سوچتا رہتا کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اس کے انجام کو سوچ کر چونک جاتا۔ اس خطرناک صورتِ حال کا نتیجہ......آج اس کے سامنے آچکا تھا۔ دفتر سے واپسی کے بعد وہ جیوں ہی گھر میں داخل ہوا تو اس کی نظر شبنم پر پڑی جو گم سُم تھی۔ اس کی اُداس نظروں نے ایک ہی جھٹکے میں سارے شکوے گلے کہہ ڈالی تھیں۔ جب اس نے خیریت پوچھی تو اس کی امی غصّے میں بول اُٹھیں......

''اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دیا ہے۔ اور اب اسے واپس یہاں بھیج دیا ہے۔''

یہ سن کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کی ساری حرارت شل ہو گئی ہو۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی اسے سنبھالنے لگی۔ تبھی اس کی امی زوردار آواز میں چلائیں......

''ہٹ یہاں سے، کم بخت۔'' اور اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ پھر بولیں......

''بیٹا، تُو بھی اُس ناہنجار کو سبق سکھا، اپنی بیوی کو بھی طلاق دے کر واپس اس کے گھر بھیج دے تاکہ ان لوگوں کے دماغ ٹھکانے آجائیں۔''

اِتنا سننا تھا کہ اس کی بیوی زوروں سے کانپنے لگی۔ اس نے اپنی امی کو خاموش کرایا اور صبح

کے انتظار کی تلقین کی۔

ساری رات وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ شبنم کے حادثہ سے وہ بے حد پریشان اور بے چین تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایسے پُر آشوب ماحول میں وہ بہت بے بس اور مجبور ہوکر رہ گیا تھا۔ اس درمیان رہ رہ کر اس کو اپنی امی کے غصّے کا احساس ہوتا اور وہ بدلے کی آگ میں خود بھی جلنے لگتا۔ اپنی بیوی سے اس کے تعلقات کبھی بھی کشیدہ نہیں ہوئے تھے بلکہ خوشگوار ماحول میں دونوں کی اِزدواجی زندگی اچھی طرح گزر رہی تھی۔ پھر اسے خیال آتا کہ اپنی شریکِ حیات کو دوسرے کے کئے کی سزا دینا، اس کو بے گھر کرنا اور طلاق دے کر بدلہ لینا کتنا صحیح ہوگا؟ وہ رات بھر اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس درمیان کب اس کی آنکھ لگ گئی، اسے ہوش نہ رہا۔ اس کی نیند اس وقت کھلی جب دروازہ پر کسی کے دستک دینے کی آواز آئی۔ اس نے بے خیالی میں جیسے ہی دروازہ کھولا تو شبنم کے دیور سہیل کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ وہاں موجود سارے لوگ اس کو ایک ٹک گھورنے لگے۔ لوگوں کی خاموشی اور فیاض کی بے رُخی کو دیکھتے ہوئے وہ بول اُٹھا۔۔۔۔۔۔

''نوشے بھائی ...... ! بھائی جان کی نازیبا حرکت اور بھابی کے گھر چھوڑ کر جانے کی خبر سے ہم سبھی لوگ بہت شرمندہ ہیں۔''

''اب شرمندگی اور افسوس ظاہر کرنے سے کیا فائدہ؟'' فیاض نے درد بھرے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''نوشے بھائی...... آپ کی بہن ہمارے گھر کی عزت ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بھائی

جان نے طلاق جیسے مکروہ فعل سے دو خاندانوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہم لوگ نا قابلِ معافی ہیں، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' یہ پوچھتے ہوئے فیاضؔ اس کی جانب مخاطب ہوا۔

''میں اپنے ہوش وحواس میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ گھر کے چراغ سے گھر کو جلنے نہیں دوں گا بلکہ آپ کی بہن کو اُسی عزت اور رُتبہ سے گھر کی بہو کا درجہ دلواؤں گا۔ بدلے کی آگ میں، میں اپنی بہن کو جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں آپ کی بہن سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی فیاضؔ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے۔ اسے اس اضطراب آمیز سکون میں ایسا لگا جیسے اس کی بہن شبنمؔ کی زندگی جو منجھدار میں ڈوبتی کشتی کی مانند ہوگئی تھی، اس کو ایک نیا کنارہ مل گیا ہے۔!

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

اِحتجاج

شریف صاحب دفتر سے آ کر تازہ دَم ہونے کے لئے چائے کی چسکی لے رہے تھے کہ اُسی درمیان ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُنہوں نے رسیور اُٹھایا اور ہم کلام ہوئے۔ اسی وقت بیگم نے آ کر پوچھا کہ کس کا کال ہے؟ رسیور رکھتے ہوئے شریف صاحب نے بے دلی اور روندھی ہوئی آواز میں کہا------

''صالحہ کا۔ وہی اس کے سسرال والوں کا پرانا الاپ ہے۔''

''کیا پھر کوئی نئی فرمائش کی ہے؟'' بیگم نے پوچھا۔

''ہونہہ......'' کہہ کر شریف صاحب نیم دراز لیٹے ہوئے، فکر کی گہرائیوں میں گُم ہو گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب میں کیا کروں؟ جب سے بیٹی کی شادی کی ہے، اس وقت سے لے کر سال بھر کے بعد بھی انجانی فرمائشوں سے وہ نجات نہیں پا سکے۔ اُنہیں بخوبی یاد ہے کہ شادی کے آخری دِن تک نت نئی فرمائشوں کو جٹاتے جٹاتے قرض کے پہاڑ تلے دبتے چلے گئے۔ یہ لامتناہی سلسلہ ایسا چلا کہ آج تک فرصت ہی نہیں ملی۔ اور اب پھر ایک فرمائش......یا خدا......اب میں کیا کروں؟ یہ تو اب بہت مشکل ہے۔ جس

کی بنیاد پر ساری فرمائشیں پوری کرتے چلے گئے۔ اب اُس کی باری ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔ وہ رات بھر سوچتے رہے کہ کل مجھے صالحہ کے یہاں جانا چاہئے۔ اس کے سسرال والوں سے میں کیا کہوں گا، سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اسی اُدھیڑ بن میں کب انہیں نیند آگئی یہ پتہ ہی نہیں چلا۔

صبح کو تیار ہوکر شریف صاحب، صالحہ کے سسرال کی طرف نکل پڑے۔ راستے بھر ترکیبیں سوچتے رہے۔ اگر دوٹوک جواب دیتا ہوں تو اس کے سسرال والوں کا پتہ نہیں کیا ردِ عمل ہوگا۔ صالحہ جو ان کی اکلوتی اور بڑی بیٹی ہے اور وہ اُنہیں دِل و جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس کی فرمائش بچپن سے لے کر آج تک بلا تامل پوری کرتے چلے آرہے تھے۔ حالانکہ ان کے دو کم عمر بیٹے بھی ہیں جو اِن دنوں زیرِ تعلیم ہیں۔ اپنے ان دو کم سن بچوں کی بھی فکر ہے۔ ایک چھوٹی سی ملازمت، اِس میں وہ کیا کیا کر سکتے تھے۔ زندگی کی پوری کمائی تو صرف ایک بیٹی کی شادی میں صرف کر چکے ہیں۔ بس ایک پونجی بچی ہے وہ بھی آدھی ادھوری اُسے بھی دے دوں تو آخر اپنے اِس چھوٹے سے کنبہ کا آشیانہ ہی اُجڑ جائے گا۔

صالحہ کا مکان آچکا تھا۔ دروازہ پر دستک دیتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔ ان کے سمدھی نے صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شریف صاحب اندر سے بالکل گھبرائے ہوئے نروس تھے۔ اسی درمیان ان کی سمدھن اور صالحہ بھی اندر سے باہری کمرے میں آچکی تھی۔ خاموشی توڑتے ہوئے ان کے سمدھی نے رسمی گفتگو شروع کی اور پھر اپنے مقصد کی حصولیابی کے لئے تمہید باندھتے ہوئے کہنے لگے------

''بھائی صاحب! آپ نے اپنی بچی کی شادی میں لگ بھگ سبھی چیزیں دیں،

ہر سامان بغیر مانگے، ہی دیا۔ یہ تو آپ کا بڑا پن اور شوق ہے، اور کیوں نہ ہو آپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اب تھوڑے، ہی کوئی دوسری بیٹی بیاہنی ہے۔''

اسی درمیان شریف صاحب نے جواب دیا------

''بھئی ...... ہمارے دو بچے اور بھی ہیں، ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ بھی حائل ہے۔''

''لیکن یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ تو نہیں ہے آپ کے لئے۔ آخر آپ ایک انجینئر ہیں، آپ کے لئے کیا ہے؟ آپ اگر چاہیں تو ایک مکان کیا، کئی مکانات تیار کرا سکتے ہیں۔'' ان کے سمدھی نے اصل مطلب کی بات ظاہر کر دی۔

''یہ تو اب بہت مشکل ہے اور ہماری آمدنی بھی محدود ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے اور کوئی وسائل نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری مجبوری ہے کہ آپ کی یہ فرمائش میں پوری نہیں کر سکتا۔'' شریف صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہی ہے...... انجینئر صاحب کی بیٹی اور ان کا داماد کرایہ کے مکان میں دردر کی ٹھوکریں کھائے، ان کو اچھا لگے گا۔'' سمدھن نے تقریباً تلملاتے ہوئے طنزیہ انداز میں سناتے ہوئے کہا۔

اِس سے پہلے کہ شریف صاحب انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ان کے سمدھی نے آگے کہا------

''میں نے آپ کو دو باتوں کے لئے بلایا تھا۔ ایک بات تو آپ نے ختم ہی کر دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگ کل اپنے گاؤں جا رہے ہیں، ایک دو ماہ کے بعد فصل کا حساب و کتاب کر کے واپس لوٹیں گے، تب تک کے لئے بہو کو آپ اپنے گھر لے

جائیں، وہاں سے واپس آنے پر فون کر اسے بلالوں گا۔''

ان کی باتیں سن کر شریف صاحب سکتے میں آگئے۔ ان کی بیٹی صالحہ بے یارومددگار وہاں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی مایوسی اور پریشانی ظاہر کررہی تھی کہ اس کے دِل کو لعن و طعن سے چھلنی کردیا گیا ہے۔ شریف صاحب نے خود کو سنبھالتے ہوئے صالحہ پر ہونے والے مظالم اور اذیتوں کے مدنظر اس کو فی الحال اپنے گھر لے جانا بہتر سمجھا۔

تین چار مہینے انتظار میں یونہی گزر گئے۔ شریف صاحب دِن رات فکرمند رہتے۔ صالحہ کو گم سُم دیکھ کر ہمیشہ سوچتے رہتے کہ کیا کروں؟ اُنہوں نے اس کے سسرال والوں کے گاؤں کے پتے پر کئی خطوط بھی لکھے مگر ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ بار بار فون کرتے رہے۔ وہ بذات خود بھی گاؤں گئے تو انہیں ہر بار یہی تسلی دی جاتی رہی کہ ''بہت جلد شہر پہنچ رہا ہوں۔'' دو تین ہفتے تک کافی انتظار دیکھنے کے بعد آخر کار وہ ان کے ڈیرہ پر پہنچے تو ان کو بغل والے پڑوسی سے یہ معلوم کر بے حد افسوس ہوا کہ ''ان کے سمدھی نے یہ مکان خالی کردیا ہے اور اب وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ یہ تو کسی کو پتہ نہیں ہے۔'' وہ ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہوکر گھر واپس آگئے۔ ایک روز جب وہ اپنی بیگم سے باتیں کررہے تھے کہ اسی درمیان ان کے ایک دوست نے آکر یہ غمناک خبر دی کہ ''تمہارے سمدھی جبار صاحب، اب وہاں نہیں رہتے ہیں۔ وہ تو دوماہ قبل ہی دوسری جگہ شفٹ کر گئے تھے۔ اور آج وہ اپنے بیٹے اکرم کی شادی ایک بڑے گھر میں کرنے جارہے ہیں۔'' یہ سنتے ہی شریف صاحب تقریباً شل ہوگئے۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کی قوت مدافعت بھی ختم ہوگئی ہے۔ ان کے گھر والوں نے ان کو سنبھالا اور ہوش میں لایا۔ صالحہ جو ایک مدت سے گُم سُم تھی وہ تقریباً چیخ پڑی——

''میں اب بالکل چپ نہیں رہوں گی، ان لوگوں نے میرے ابو کو بہت اذیت دی ہے۔ اور مجھ پر بھی بہت ظلم کیا ہے۔''

اتنا کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے ابو کے دوست کو لے کر گھر سے نکل پڑی جنہوں نے آکر ایسی دِل آزار خبر سنائی تھی۔ محلے کے دیگر لوگ بھی اس کی آواز سن کر اس کی ہمدردی میں اس کے ساتھ ہو گئے۔ صالحہ ایک جنونی کیفیت میں اس منزل پر پہنچنے کے لئے کافی بے چین تھی۔ اب صرف وہی تصویریں بار بار اس کی نظر کے سامنے گھوم رہی تھیں جو ایک سال کے اندر اس کی ساس اور خسر کے بار بار طعنے، ہر بات پر جھنجھلاہٹ بھرے جواب اور زدوکوب سے ذہنی اور جسمانی تکلیف برداشت کرنا۔ اس پر شوہر کی بے توجہی۔ خود کو بے سہارا ہونے کی وجہ سے صبر کرتے کرتے وہ ٹوٹتی جارہی تھی۔ حالانکہ اس کے ابو نے اپنی بیٹی کے جہیز میں کیا کچھ نہیں دیا تھا۔ آخر دم تک وہ اس کے سسرال والوں کی فرمائشیں پوری کرتے چلے گئے تھے۔ اس کے باپ کی شرافت کا یہ صلہ دیا اُن لوگوں نے؟ صالحہ اور اس کے ہمراہ لوگوں کا ایک ہجوم اس منزل پر جا پہنچا جہاں اس کے شوہر اکرم کی دوسری شادی کے شادیانے بج رہے تھے۔ ہر طرف آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب نکاح کی رسم پوری ہونے والی ہے۔ لوگ ایک طرف سمٹ رہے تھے اسی اثنا میں قاضی صاحب نکاح پڑھانے وہاں پہنچے۔ اس سے قبل کہ شادی کی اصل رسم شروع ہوتی صالحہ زوردار آواز میں چیخ پڑی------

''رُکیے قاضی صاحب......!'' اس کی آواز سُن کر محفل میں موجود تمام لوگوں کی نگاہیں صالحہ پر جم گئیں۔ لڑکے کے والد صاحب اور دوسرے لوگ اس کی طرف لپکے اور کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ صالحہ ایک بار پھر زوردار آواز میں بولی------

''وہ شخص جو شادی رچا رہا ہے وہ میرا شوہر ہے اور میں اس کی بیاہتا بیوی ہوں اور اس کے والدین جنہیں نہ تو عزت سے پیار ہے اور نہ ہی رِشتہ کا کوئی خیال، یہ مال و دولت کے حریص لوگ رِشتے بنانے کے لئے یہاں نہیں آئے بلکہ رِشتوں کی سوداگری کے لئے ہی آئے ہیں۔آج اُنہیں اپنے بیٹے کے رِشتہ کی ایک بڑی قیمت وصول کرنی ہے جو بہت پہلے ہی فروخت کر چکے تھے۔شائد آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ یہ لوگ جہیز کے نام پر ہمارے ابو سے آخر دَم تک وصولتے رہے پھر بھی ان کے لالچ اور ہوس کی بھوک ختم نہیں ہو پائی۔میرے ابو سے سب کچھ وصول کرنے کے بعد اب مکان طلب کرنے لگے۔میرے ابو شائد ان کی یہ فرمائش بھی پوری کر دیتے مگر ان ظالموں کو کیا معلوم کہ انہوں نے اپنے مکان کو ہی گروی رکھ کر وہ سارے جہیز کا مطالبہ پورا کیا تھا۔ جس کا خود کا آشیانہ ہی داؤ پر لگ گیا ہو وہ بھلا اب کون سے داؤ لگائے؟''

وہ یک لخت بولے جا رہی تھی۔کسی کو اس کی باتوں کا جواب دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔اس نے پھر کہا------

''مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ یہ دوسری یا تیسری شادی کریں۔اب انصاف سماج کو کرنا ہے اور اُسے سوچنا ہے۔میں تو اِس نامراد شخص سے ابھی اور اسی وقت نجات چاہتی ہوں اور یہ لوگ میرے ابو کا دیا ہوا سارا جہیز، سارا سامان اور ایک ایک پائی واپس کر دیں۔'' وہاں پر موجود سارے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔عین اسی وقت اسلم صاحب اس کی طرف بڑھے اور کہنے لگے------

''بیٹی......! میں تمہاری باتوں کی تائید کرتا ہوں کہ جبار صاحب کو تو وہ پورا کرنا ہی ہوگا جو تم نے کہا ہے۔ساتھ ہی میں اس حریص اور مکار آدمی سے ابھی اور اسی وقت

قطع تعلق کرتا ہوں اور اِس شادی کو نامنظور بھی کرتا ہوں جو میں نے اپنی بیٹی کے لئے انجانے میں طے کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں تم کو مبارک باد بھی دیتا ہوں کہ تم نے بڑی ہمت کر کے اپنے ظلم کے خلاف ایسے حریص اور سماجی درندوں کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ اِحتجاج کی پہل کی ہے، یہ تمہارا حق بھی ہے اور فرض بھی جسے سماج کو منظور کرنا ہی ہوگا۔''

اور پھر اسلم صاحب چلتے ہوئے نوشے کے پاس گئے اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے اس سے کہا------

''میاں! اب اپنے گھر جاؤ......'' ان کے ایسا کہنے پر ساری محفل بے رنگ ہوگئی۔!

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

اپنی پہچان

آج سشما بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اُسے ایک مدّت کے بعد اتنی بڑی خوشی ملی تھی۔ یہ خوشی اُس کی خود اعتمادی کا بہترین ثمرہ ہے جو کچھ عرصہ قبل اس میں یکا یک پیدا ہو گیا تھا۔ اِس سے قبل وہ عام عورتوں کی طرح خود کو کمزور اور بے سہارا محسوس کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈر، خوف اور سماجی حدود کے دائرں میں جینا وہ اپنا مقدر سمجھتی تھی۔ شائد اسی لئے سماج کے ان بوسیدہ رَسم ورَواج سے بھی بغاوت کرنا گناہِ عظیم سمجھتی تھی۔ حالانکہ وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ فطرت کو دبانا ٹھیک نہیں، یہ ایک جبر ہے۔ باوجودیکہ خود کو ایسے حالات میں سر خم کرنا اس کی ایک بڑی مجبوری تھی۔

یکا یک اس کا ذہن ماضی کے اُن تلخ اَدوار کی طرف جست کر گیا جب وہ خود کو بدقسمت تصوّر کرتی تھی۔ اس کے سارے خواب یکا یک ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ حالانکہ اس کی شادی کے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح بہت خوش تھی۔ بہت سارے ارمان اور سُنہرے خواب بُنے تھے اس نے۔ مگر وہ خواب محض خواب ہی رہ گئے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی تعبیر اتنی بھیانک اور لرزہ خیز

ہوگی؟ اس کا شوہر سفر کے دوران ایک حادثہ کا شکار ہوکر اسے اِس ظالم دُنیا میں اکیلا اور بے سہارا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا تھا۔ سسرال والوں نے اُسے بے جا طعنہ دے کر منحوس، یہاں تک کہ اسے ڈائن تک کہہ ڈالا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اس کے مائیکا بھی واپس بھیجوا دیا تھا۔ مائیکا میں سبھی لوگ موجود تھے۔ ماں، باپ اور بڑا بھائی مگر وہ خود کو اکیلا اور بے سہارا سمجھتی رہی۔ اب اُسے نہ تو کسی تہوار کی آمد کی خوشی ہوتی اور نہ کسی شادی بیاہ کی اُمنگ حالانکہ وہ شادی سے قبل کافی چنچل اور شوخ مزاج لڑکی تھی۔ ہنسنا اور ہنسانا اس کا شیوہ تھا۔ ایک پل کی خاموشی اسے بری طرح کھٹکتی تھی۔ اگر کوئی اس کے قریب خاموش اور سنجیدہ ہوتا تو اسے مذاق کا نشانہ بنائے نہ چھوڑتی۔ لیکن اب وہ اِس قدر سنجیدہ اور خاموش طبع ہوگئی تھی جیسے کہ وہ اپنی پچھلی یادداشت کھو چکی ہو حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے شکایت تھی تو بس اتنی کہ بھگوان نے اسے کم نصیب کیوں بنایا؟ لوگ اسے بدنصیب اور منحوس کیوں کہتے ہیں؟

وہ جینا چاہتی تھی کیونکہ زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اس نے تو زندگی کی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ اچانک خزاں آ گیا۔ اس کے بڑے بھائی چاہتے تھے کہ اس کی دوسری شادی کر دی جائے۔ اس کے والدین شروع میں راضی نہ ہوئے مگر بعد میں کافی سمجھانے بجھانے پہ تیار ہو گئے تو سماج کی بے جا رسم اور رواج نے رُکاوٹ پیدا کر دی۔ اب اس کے والدین بھی دِن رات اِس فکر میں رہتے کہ کیا کیا جائے؟ رفتہ رفتہ وہ والدین کی نگاہوں میں خود کو انجانا بوجھ لگنے لگی تھی۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ اب اس کا جینا محال ہے۔ ایسے حالات میں وہ کب تک زندگی کی منتیں مانگتی رہتی۔ اُسے اپنا گھر بھی اب پرایا لگنے لگا تھا۔ تب ہی اسے یہ خیال آیا کہ شائد پرانے زمانے میں ایسے

حالات کے سبب ہی بیوہ عورتیں اپنے شوہر کی چتاؤں پر ستی ہو جایا کرتی تھیں تا کہ سماج میں لوگ اُسے منحوس نہ کہہ سکیں اور نہ ہی وہ گھُٹ گھُٹ کر مر سکیں۔ سماج نے ستی رواج کو تو ختم کر دیا، لیکن عورتوں کی دوسری شادی کو وہ مرتبہ نہیں دیا جس کی ایک بڑی ضرورت تھی۔ بیوہ کی شادی ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی کٹی پتنگ کا استعمال ہو۔ ایسی باتیں سوچ کر وہ بیحد پریشان ہو جایا کرتی۔ اس کی زندگی میں دِن بہ دِن نا اُمیدی کے سائے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ تاریکیاں اس کی زندگی کا مقدر بنتی جا رہی تھیں۔ ایک اچھی زندگی جینے کی تمام راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ تب ہی اسے بچپن کی ایک درسی کتاب کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک فقیر جو روزانہ گھوم گھوم کر بھیک مانگا کرتا تھا اور اپنا پیٹ بھرا کرتا تھا، اس نے دورانِ سفر ایک جنگل میں گیدڑ کو شیر کا چھوڑا ہوا شکار کھاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ گیدڑ نے تو کوئی محنت نہیں کی پھر بھی اس کو کھانا مل گیا۔ یہ سوچ کر اس نے اِدھر اُدھر گھومنا چھوڑ دیا۔ ایک دِن...... دو دِن...... اور پھر کئی دِن...... گھر میں پڑا رہا، مگر اسے کہیں سے بھی کھانا نہیں مِلا۔ اِس طرح وہ کافی کمزور اور نحیف ہو گیا۔ تب اسے علم ہوا کہ جینے کے لئے شیر کی زندگی بہتر ہے جو اپنا شکار خود کرتا ہے، دوسروں کے شکار کے سہارے نہیں جیتا بلکہ اپنے کئے ہوئے شکار کا حصّہ دوسروں کے لئے بھی چھوڑ دیتا ہے۔

اِس قصہ سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ اِس سے اُس کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اُسے وہ دِن آج بھی بخوبی یاد ہے جب اس میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اسی دن اپنے والدین سے کالج میں داخلہ کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملتے ہی اس نے پی۔ جی۔ شعبہ میں ایم۔ اے۔ کی طالبہ کی حیثیت سے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد حصول تعلیم تھا۔ اس کا ذہن اب نصاب کے

مطالعہ کی طرف لگا رہتا۔ دِن رات کی کوشش اور لگن نے اُسے کامیابی کی منزل دِلا دی۔
ایم.اے. پاس کرنے کے بعد اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ اسے اس کامیابی سے یہ
احساس ہوا کہ وہ اپنی منزل خود طے کر سکتی ہے۔ اس فکر نے اس میں اور جلا بخش دی۔
اب وہ اس قابل بننا چاہتی تھی کہ دوسرے لوگ اس کو اپنا سہارا تصوّر کریں، نہ کہ یہ کسی
دوسرے کا سہارا بنی رہے۔ اس خیال کے تحت مقابلہ جاتی امتحانوں کی طرف مائل ہوئی۔
اس درمیان اس کی ملاقات کوچنگ سینٹر میں نریش سے ہوئی جو بے حد خوبصورت نوجوان
تھا۔ اس کے بلند حوصلے اور جدید ذہن وفکر سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ نریش کو جب سشما
کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ اپنی کم سنی میں ہی بیوہ ہوگئی ہے تو اُسے اس سے ہمدردی
ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بلند حوصلے سے اِس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ان
میں قربت بڑھ جاتی ہے۔ ایک ہی کوچنگ سینٹر میں امتحان کی تیاری کے باعث کبھی کبھی
جوائنٹ اسٹڈی کے مواقع بھی آتے رہے۔ اسی دوران آپسی تبادلۂ خیال میں ہم آہنگی
ہوتی رہی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے خیالات میں کافی مماثلت نظر آتی تھی۔ سشما نے
اس کے خیالات میں کافی بلندی پائی اور محسوس کرنے لگی کہ یہ میری زندگی کا ہم سفر بن
سکتا ہے۔ اس میں ایک بار پھر وہ جذبہ پیدا ہوا جو گرم راکھ کی طرح دبا ہوا تھا اور ......
کیوں نہ ہوتا، ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی۔ کم سنی ہی میں تو اُس کا وہ سکھ چھن گیا تھا جس کی
آرزو اور تمنا اکثر لڑکیاں کرتی ہیں۔ اِس نئے ماحول سے اُس میں زندگی کی بھرپور قوت
پیدا ہو چکی تھی۔ وہ پورے مضبوط ارادے اور خود اعتمادی کے ساتھ مقابلہ جاتی امتحان میں
شامل ہوئی۔

اس کی بے پناہ کاوش اور جانفشانی کے آگے اس کے نصیب کا ستارہ

جگمگا اُٹھا...... وہ اُس بڑے مقابلہ جاتی امتحان میں سرفہرست آچکی تھی۔ اور آج...... وہ خود کو ایک مضبوط خاتون تصوّر کر رہی تھی۔ سبھی لوگ اُسے مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ گھر کے علاوہ سماج کے دوسرے لوگ بھی اُس کی قسمت پر اب رشک کرنے لگے تھے۔ اس پُر مسرت ماحول میں جب نریش کے والدین نے سشما سے شادی کرنے کی تجویز پیش کی تو اس کے گھر والے حیران تھے۔ کیونکہ نریش اس کے پہلے شوہر کا چھوٹا اور سگا بھائی تھا۔!

☆☆☆

(آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

اِستحصال

تقریباً تین سو کی آبادی پر مشتمل گاؤں، شہر سے کافی دوری پر واقع تھا۔اس گاؤں میں چالیس مکانات ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تھے۔ جن میں ۲۵ مکانات اونچی ذات والوں کے اور باقی کچے مکانوں کے علاوہ چند جھونپڑیاں بھی تھیں جن میں اونچی ذات والے کاشتکار کے ہرواہے دُوساد ھ رہا کرتے تھے۔ بیچارے دُوسادھ ذات کے خانوں میں بٹے ہریجن کی گنتی میں شمار کئے جاتے تھے، جن کی قسمت میں شائد غلامی اور جی حضوری ہمیشہ کے لئے لکھ دی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی نسل در نسل غلامی کے لئے ہی پیدا ہوتی اور غلامی کرتے کرتے موت سے ہمکنار ہو جاتی تھی، لیکن قرض اور غلامی سے کبھی نجات نہیں ملتی۔ ظلم اور تعصب پرستی کی حد ہو چکی تھی۔ یکا یک ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ سماجی نابرابری کے خلاف ایک قافلہ اُس منزل کی طرف چل پڑا جہاں جینے کا مساوی حق حاصل ہے۔ اور یہاں صرف عبادت گاہوں کے دروازے نہیں کھولے گئے ہیں بلکہ دِل کے بھی دروازے کھلے ہیں۔ اس تحریک سے گاؤں کے مکھیا اور سرپنچ کو بڑی فکر ہوئی کیونکہ ان کے زر خرید غلام اب ان کی غلامی سے نجات پا چکے تھے۔

اِس تحریک سے ہر گو بند بھی متاثر ہوا، کیونکہ وہ بھی ایک ہریجن تھا۔

پُو پھٹ چکی تھی اور سورج رات کی سیاہی پر غالب ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ہرواہے کھیت کی جانب جا رہے تھے۔ سدھا جو ہر گو بند کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ اپنی گگری لے کر گاؤں کے اس کنویں پر جا رہی تھی جہاں سے صرف ہریجن ذات کے لوگ پانی لیا کرتے تھے۔ یکا یک راستے میں اس کی نگاہ سرپنچ کے چھوٹے بیٹے راجو سنگھ پر پڑی جو شائد اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی کیونکہ راجو اس کے بچپن کا پریمی تھا جس وقت دونوں پاٹھ شالا میں ہم جماعت تھے۔ راجو اس کے قریب آتے ہی بول اُٹھا۔۔۔۔۔

''کدھر جا رہی سُدھا......؟ ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور تو دیکھ کر بھی نہیں رُکی۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

سُدھا نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ''راجو! اب ہم سُدھا نہیں رہے، ہمارا نام مریم ہے، میرے بابو مسلمان ہو گئے ہیں، کل ہی ہم لوگ سب کے سب مسلمان ہوئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی راجو نے کہا۔۔۔۔۔

''یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ سب کا سب میاں بن گیا ہے۔ ارے میاں بننے سے کیا فائدہ؟''

''کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو، لیکن اِتنا تو ضرور ہے کہ وہاں ذات پات کا بھید بھاؤ نہیں ہے، جبکہ تم لوگ ہم لوگوں کو ہمیشہ نیچی اور حقیر نظر سے دیکھتے ہو۔ اس دھرم میں چھوا چھوت بالکل نہیں ہے۔ یہاں سب لوگ ایک ساتھ کھاتے پیتے اور اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔'' سدھا نے اسے بتایا۔

اس کی باتوں کو سنتے ہی راجو پھر بولا------

''نہیں سدھا! اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ دیکھو ہم اونچی ذات کے ہو کر بھی تم سے پریم کرتے ہیں۔''

''وہ بچپن کا زمانہ تھا، راجو بابو...... جب ہم نا سمجھ تھے۔ لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ تم جیسے اونچے لوگ اِس بستی میں نہ جانے کتنی معصوم ہریجن لڑکیوں سے پہلے پریم کا ڈھونگ رچاتے ہو اور پھر اسے موت کے گھاٹ پہنچا دیتے ہو۔ اگر تم ہم سے سچ مچ پریم کرتے ہو تب تم بھی مسلمان ہو جاؤ۔'' اِتنا کہہ کر وہ کنویں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

اگلی صبح راجو کنویں سے کچھ فاصلے پر اس کے آنے سے پہلے اس کی راہ تک رہا تھا۔ حسبِ معمول وہ گگری لیئے چلی آ رہی تھی کہ یکایک اس کی نظر راجو سے دوچار ہو گئی۔ راجو اس کے نزدیک آتے ہی بولا------

''سدھا......! تجھے اِس گاؤں کو چھوڑ کر ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''مگر کیوں......؟'' اس نے پوچھا۔

''بس ابھی چلنا ہے، ہم تمہارے بنا نہیں رہ سکتے ہیں۔'' راجو نے پیار جتاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہم نہیں جا سکتے ہیں۔'' سدھا جو اَب مریم تھی، کا اٹل فیصلہ سن کر اُس کے تیور بدل گئے، وہ بے حد غصہ سے بھر گیا اور اس کے دو مضبوط اور سخت ہاتھ اس کی گردن پر منجمد ہو گئے۔!

☆☆☆

ہفت روزہ ''ایک قوم''، پٹنہ

پسپائی

اُسے صرف اِتنا یاد ہے کہ بستی کی چند عورتیں اور کچھ لڑکیاں اس کے آنگن میں بڑی ہی پُر کیف آواز میں گیت گاتی تھیں۔ اور وہ ان پیارے گیتوں کو سُن سُن کر ایک عجیب سی گدگدی محسوس کرتی تھی۔ اور جب بستی کی رِشتے میں لگنے والی بھابی اور کنواری لڑکیاں اُسے چھیڑتیں تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی ...... یہ سلمہ کی زندگی کی پہلی خوشی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ کیف و مسرت سے نا آشنا تھی۔ اپنی عمر کی دسویں بہار دیکھنے سے قبل ہی وہ شفقتِ پدری سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ماں کے آغوش اور اپنے اکلوتے بھائی کی سرپرستی میں پرورش پا رہی تھی۔ یکا یک بستی میں ہیضے کی وبا نے اس کی ماں کو بھی اس سے جدا کر دیا تھا۔ اب صرف بھائی ہی اس کا باپ اور بھابی ہی اس کی ماں تھی لیکن حقیقی ماں کچھ اور ہی ہوتی ہے اِس کا اسے احساس بارہا ہوا تھا...... لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ زندگی کے ان اوقات کو یونہی گزار رہی تھی جیسے اس کے دِل میں کوئی اُمنگ نہ ہو۔ یقیناً جس کے دِل میں کسی طرح کی کوئی اُمنگ نہ ہو تو اس کا جینا نہیں جینے

کے برابر ہوتا ہے۔

سُنہری یادیں دِل میں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ انہیں یاد کرنے پر ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ابھی اور اسی وقت اس کے ساتھ ایسا خوشگوار ماحول بنا ہے اور وہ ان میں شریک ہے۔ رُخصتی کے وقت سلمٰہ اپنے میکے سے ایک سماجی رَسم کے مطابق اس جگہ جا رہی تھی جہاں اس کا اپنا جانا پہچانا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں کے سبھی لوگ اس کے لئے اجنبی تھے۔ اور وہ اُن تمام اجنبیوں میں ایک نئی نویلی دُلہن، کسی کی بہو، کسی کی بھابی اور کسی کی رفیقِ حیات ...... آنکھوں سے آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے اس کے رُخسار پر گر کر جذب ہو رہے تھے جیسے ایک مدّت پہ بارش ہوئی ہو اور اِس بارش کا ہر قطرہ خشک زمین پر گرتے ہی جذب ہو جاتا ہے۔ یوں تو غموں کے آنسو کئی بار اس کی نرگسی آنکھوں سے بہے تھے، لیکن یہ پہلا آنسو تھا جس کے بہنے سے اُسے فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈولی پر جاتی ہوئے بستی کی کئی لڑکیوں کو اُس نے سسکتے ہوئے دیکھا تھا۔ سلمٰہ تنہائی میں اکثر سوچتی کہ مجھے بھی ایک نہ ایک دِن اسی طرح ڈولی میں بیٹھ کر جانا ہوگا۔ آج سلمٰہ کا خواب پورا ہو رہا تھا۔ وہ بھی شادی کے کپڑوں میں ملبوس ڈولی میں ایک طرف سکڑی بیٹھی ہوئی کہار کے سہارے اس جگہ جا رہی تھی جو اَب اس کا اپنا گھر ہوگا اور وہ اس گھر کی مالکن ہوگی۔ اس کے تمام ارمان اور خواہشیں پوری ہوں گی جس کا خواب ہر کنواری لڑکی اپنی شادی سے پہلے دیکھا کرتی ہے۔

خواب عموماً سچے نہیں ہوا کرتے۔ اس کی تعبیر الگ ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہر انسان اپنی حیثیت سے کچھ اونچا ہی خواب دیکھا کرتا ہے۔ اس نے بھی خوابوں کے کئی قلعے بنائے تھے، لیکن کوئی بھی خوابی قلعہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا تھا۔

یہاں تک کہ اس کے خواب کی سچی تعبیر ہی بدل گئی تھی۔ چند خوشگوار دِنوں کے بعد اس کے سرتاج اس سے اِس طرح الگ ہوئے جیسے اس کے سر پر تاج رکھ کر کسی نے پھر چھین لیا ہو۔ یعنی کسی غیر مستحق کو یہ اعزاز لاعلمی یا جبر سے بخش دیا گیا ہو۔ اس کا شدید احساس اسے بعد میں ہوا۔ شاہد اسے اپنے والدین کے ساتھ چھوڑ کر ایک شہر کے اس دُھند میں جا چھپا جہاں تک اس کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ دِن، ہفتے، مہینے اور پھر سالوں گزر گئے۔ نہ کوئی خط، نہ کوئی پیغام، صبح ہوتی، شام ہوتی اور پھر کالی رات آجاتی۔ لیکن وہ دِن پھر کبھی نہیں آیا جس کا انتظار وہ سالوں سے کر رہی تھی۔ وہ صبح کبھی نہیں ہوئی، رات کا وہ سہانا پن پھر نصیب نہیں ہوا، دِن تو کسی طرح کٹ ہی جاتا، لیکن کالی رات کاٹے نہیں کٹتی۔ مائیکا جانے کا ارادہ کر کے اس لئے نہیں جاتی کہ پتہ نہیں وہ کب آجائیں اور مجھے نہ پا کر انہیں صدمہ ہو۔ صبر واستقلال اور عقل وشعور کے تحت وہ اپنے دِل کو سمجھاتی رہتی، لیکن احساسِ محرومی اس پر غالب آجاتی۔ باوجودیکہ احساسِ محرومی سے جنگ کرتی رہی لیکن کب تک......؟

بستی کے جُمّن بھیا جب شہر سے لوٹے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ شہر میں کسی اور کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ اسے ایسا لگا کہ اُمیدوں کے موتی کچے دھاگے کے یکلخت ٹوٹ جانے پر سبھی بکھر گئے ہوں۔ اس کی تمناؤں کا خون ہو گیا۔ وہ اپنے دِل کے ان زخموں کو کسے دِکھاتی جو اس کی کسک کو سمجھ سکے۔ اس کے زخموں پر ڈھارس کے مرہم کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ...... ساس اور خسر نے بھی بھیا کو ایک خط لکھ کر اُسے اس جگہ سے بھی ہٹا دیا تھا جو اُس کے خوابوں کا مرکز تھی۔ احساسِ محرومی اب اس کی زندگی کا اٹوٹ حصّہ بن گئی تھی اور

درد اس کا ہمدم، آبلہ پائی اسے راس آئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ درد کو چنتی رہی، بٹورتی رہی اور اپنے دِل میں سموتی رہی۔

ایک طویل عرصے کے بعد یک بیک دو خطوط دو دِنوں کے آگے پیچھے اُسے موصول ہوئے...... ایک خط اس کے خُسر صاحب کا تھا اور دوسرا خط اس کے سرتاج کا تھا، جس میں اس کو اپنی غلطی کا شدید احساس اور اس کی علالت کی خبر اور اس سے ملنے کی آرزو تحریر تھی۔ یہ دونوں خطوط پاکر اس کی خوشی کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ عمر بھر کی کمائی قدرت نے یکمشت چکا دی ہو۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھی۔ اور ایسا ہونا بھی فطری تھا۔ آج دو سال کے بعد اس کا کھویا ہوا تاج پھر اس کے سر پر رکھا جا رہا تھا۔ وہ اعزاز اسے دوبارہ مِل رہا تھا جسے کسی غیر مستحق نے اس سے چھین لیا تھا۔ وہ تمنائیں یک بیک پھر سے زندہ ہوگئیں اور خوابیدہ حوصلے پھر سے جاگ گئے۔ وہ ایک بار پھر اپنے میکے سے رُخصت ہوکر اس گھر میں جا رہی تھی جو اجنبی سے اپنا اور پھر اپنا سے اجنبی بن گیا تھا۔ اُمیدیں پھر سے انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ سلمہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آج وہ پھر سے دُلہن بن کر اپنے پیا سے قریب تر ہوگی۔ یقیناً اب ہر صبح حسین ہوگی اور ہر رات خوشگوار...... شائد اس کی قسمت غلط راہ پر چل پڑی تھی جو اَب صحیح راہ سے ہوکر اپنی منزل پر آ پہنچی تھی۔ اِس طرح کے کئی لااُبالی خیالات اس کے دِل و دماغ پر چھا رہے تھے۔ اس کی گاڑی منزل کے قریب تر ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے مسافت طے کر کے سواری آگے بڑھتی جاتی، اس کی بے چینی اور خوشیوں میں اِضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آخرکار وہ منزل بھی آ ہی گئی جس کے لئے وہ مدّت سے انتظار کر رہی تھی۔ جب اس کی سواری سسرال کے قریب پہنچی تب اس کا بھائی اُتر کر ایک گھر کے باہر چند لوگوں کے درمیان گیا جہاں

اس کے خسر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اس کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بے ساختہ بول اُٹھے------

''اِتنی دیر کیوں کر دی......؟......دُلہن کے بغیر میرا بیٹا رُخصت ہو گیا۔''

اتنا سننا تھا کہ سلمٰہ پر سکتہ طاری ہو گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔اسے کسی بھی طرف اُجالا نظر نہیں آ رہا تھا۔صرف اندھیرا ہی اندھیرا گویا وہ اب پوری طرح پسپا ہو گئی تھی۔!

☆☆☆

حد کے آگے

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جو حدود سے تجاوز کر جائے اُسے ہر حالت میں نقصان ہی اُٹھانا پڑتا ہے۔ اِنسان حدود سے اسی وقت باہر ہو جاتا ہے جب اس پر ضِد غالب آجائے۔ اور ضد اُسے تباہی اور گمنامی کے اندھیرے غار تک پہنچا کر ہی دَم لیتی ہے۔ ضِد اور کھلی آزادی کا یکجا ہونا گویا حدود سے باہر ہونا ہے۔ اس کے دماغ میں نہ جانے کیوں یہ باتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ حالانکہ ایسی باتوں پر وہ کبھی دھیان ہی نہیں دیتا تھا۔ لیکن تنہائی اور بے بسی انسان کو سب کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب دِل کو چوٹ پہنچتی ہے تو آنسو نکل ہی پڑتے ہیں۔

آج اُس کے پاس سب کچھ ہے۔ ایک عالی شان بنگلہ، خوبصورت کاریں، بینک بیلنس اور ایک بڑا سا عہدہ، لیکن سب ہی بیکار ہیں کیونکہ جب دِل کو سکون اور اطمینان نہ ہو تو یہ ساری چیزیں بے معنی اور بے مصرف لگتی ہیں۔ عام طور سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جس کسی کے پاس دولت ہو اسے زندگی کا ہر سکھ، ہر عیش و عشرت حاصل ہوتا ہے، لیکن اُسے آج معلوم ہوا کہ اِن باتوں میں کتنی حقیقت ہے، کتنی سچائی ہے۔ سب

عارضی خوشیاں ہیں۔ سرور بے چین ہو گیا اور مریض کی طرح نحیف قدموں کے سہارے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکلا۔ اب شام رات کی سیاہی میں بدل رہی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ مضمحل اور اُداس طبیعت سے گاندھی میدان کی طرف ٹہلنے کے واسطے نکل پڑا۔ صرف یہی ایک جگہ ہے جہاں اُسے تھوڑا دلی سکون اور ذہنی اطمینان مِل جاتا ہے۔ وہ آج بہت افسردہ اور غمگین تھا۔ اس کا دِل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے کہیں دُور چلا جائے، جہاں کوئی نہ ہو۔ لیکن اِس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ کہیں نجات مِل سکتی ہے کیا؟ یادیں، مایوسی اور بے اطمینانی اس کا پیچھا کرتی رہیں گی۔ ہر دُکھ، پریشانی اور غم سے وہی نجات حاصل کرسکتا ہے جو بے حس ہو جائے۔ لیکن بے حسی انسانیت کا نام نہیں کیونکہ جانور بھی حساس ہوا کرتے ہیں۔ وہ اِن اُلجھنوں میں خود کو اُلجھتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ گاندھی میدان کے قریب پہنچ چکا تھا جہاں تفریح کے خیال سے لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ ایک جانب جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں پر بیٹھا اور ٹہلتا ہوا ہر شخص خوبصورت ڈھلتی ہوئی شام کا لطف لے رہا تھا۔ وہ اُن لوگوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ لیکن اُسے ہر چیز بے کیف معلوم ہوئی۔ اس کے سامنے اب صرف ایسے مسئلے تھے جن کا حل کھوج نکالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ دنیا کی ہر چیز لُٹ جانے پر واپس مِل سکتی ہے لیکن عزت نہیں۔ اِس بات کا ہوش اُسے اس وقت آیا جب مغربی تہذیب اور ماڈرن فیشن نے اسے اور اس کی خوشیوں کو دبوچ لیا تھا۔

ضِد کی ابتدا اُس وقت شروع ہوتی ہے جب اس نے اپنے والدین کی عزت کا خیال نہ کر کے اپنی ضِد پوری کی تھی۔ رام پور تفریح کی غرض سے والدین کے ہمراہ جانا اور اسی رئیس رام پور کی غیر منکوحہ بیوی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جو فیشن زدہ اور مغربی

تہذیب کی زندہ مثال تھی، اس پر دِل و جان سے فدا ہو جانا۔ فدا ہونا بھی لازمی تھا کیونکہ وہ حُسن کی پیکر معلوم دیتی تھی۔ ظاہری حُسن سے وہ بالکل آراستہ تھی۔ والدین کی مرضی کے خلاف اپنی ضِد پر قائم رہ کر اس نے شادی کر لی۔ وقت عیش و عشرت میں گزرنے لگے۔ دونوں ہم خیال تھے۔ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے دونوں علیٰحدہ ہو کر مغربی تہذیب اور ماڈرن فیشن کی پیروی کر رہے تھے۔ بلا ناغہ کلب جانا، غیروں کے ساتھ ڈانس کرنا، پینا پلانا، اور بدمست ہو کر ناجائز کو جائز تسلیم کر لینا ہی اُن کا مشغلہ ہو گیا تھا۔ کھلی آزادی اور ضِد کے سائے میں اس کی بیوی کے قدم حدود سے باہر ہونے لگے۔ وہ پیاری صورت جس پر وہ ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا تھا اب اس سے دور رہنے لگی تھی کیونکہ اس کی نظر اب پائیلیٹ راجیش پر جا ٹکی تھی۔ ہوائی جہاز چلانے کا شوق، ماڈلنگ کی لت، سیر و تفریح سے الگ گھر پر مقید ہو کر رہنا اُسے قطعی منظور نہیں تھا۔ حالانکہ وہ ایک بچی کی ماں بھی بن چکی تھی، لیکن اس کی فکر، محبت و شفقت سے دُور اپنی چاہت میں بدمست تھی۔ حدود سے باہر نکلے قدم اب اُس منزل پر جا لگے تھے جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بیوی کی جدائی اس کے دِل پر ایک بہت بڑے غم اور بڑے دُکھ سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس غم کو اس نے ایک حادثہ اور اِتفاق سمجھ کر برداشت کر لیا تھا۔

لیکن آج وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی بھی اس کی مرضی کے خلاف قدم اُٹھائے۔ اِنسان کا ایک سہارا ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوسرے سہارے کو اپنا سہارا سمجھ کر زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب دوسرا سہارا بھی اُسے بے سہارا کر دے تو جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ جب اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی تو اس نے دوسری شادی کرنے کا اِرادہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا تھا۔ اور اپنی بچی رومی کو اپنا سب

کچھ سمجھنے لگا تھا۔ اُسے اپنی زندگی، اپنا ہم خیال اور اپنا ہم راز سمجھنے لگا۔ بیٹی کی خوشی اس کی اپنی خوشی تھی۔ ہر طرح کے آرام و آسائش کا سارا انتظام تو پہلے ہی سے گھر میں تھا۔ اس کے لئے کسی قسم کی کوئی کمی نہ کی۔ حدود کے دائرے میں اسے کبھی قید نہ کیا۔ سیر و تفریح، کلب میں آنا جانا، لوگوں سے ملنے جلنے میں اُسے پوری آزادی تھی۔ اسکول سے کالج تک لاڈ و پیار میں پل کر وہ جوان ہوئی تھی۔ ابھی وہ اس فکر میں تھا کہ کوئی مناسب اور اچھا لڑکا مل جانے پر اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی بڑے ہی شان و شوکت سے کر دے گا۔ خود اس کی زندگی کا اب کیا بھروسہ، وہ تو آخر یونہی کٹ ہی جائے گی۔ اس کی خوشی اپنی خوشی تھی۔ لیکن...... اب یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی اُمیدیں بے کار ہوگئی تھیں۔ اس کی ضد کے آگے وہ کچھ نہ کرسکا۔ کھلی آزادی اور ضِد نے اسے بھی گمراہ کر دیا تھا۔ انجام سے بے خبر ہو کر اس نے وہ سب کچھ کرلیا جس کی ہمت کسی مشرقی لڑکی کو نہیں ہوتی ہے۔ اُسے پشیمانی کس بات کی ہوتی وہ تو مغربی تہذیب کی زندہ تصویر تھی۔ اس کی رگ رگ میں مغربی انداز بس چکے تھے۔ ایسا ہونا فطری تھا کیونکہ اس کی پرورش ایسے ہی ماحول اور سائے میں ہوئی تھی۔

رومی اور راجو کی کورٹ میرج کی خبر نے اُسے ایک بار پھر ایسی چوٹ پہنچائی کہ وہ اب مزید جینے کی اُمنگ سے بیزار ہوگیا۔ وہ بڑے ہی کرب و الم کی حالت میں بیٹھا سوچ رہا تھا اور اپنا محاسبہ کر رہا تھا کہ اپنے خاندان کی بے راہ روی میں پورے طور پر وہ خود ہی ذمہ دار ہے کیونکہ حد سے آگے گمراہی کے دروازے اس نے ہی کھول دیئے تھے۔!

☆☆☆ (ریڈیو پٹنہ کی اُردو سروس سے نشر شدہ)

تضاد

ماسٹر صاحب نے بچوں کو کلاس میں گاندھی جی کا پاٹھ پڑھاتے ہوئے اُن کے تین اِصلاحی پہلوؤں کو جو بندر کی تصویر سے سمجھائے گئے تھے، اپنے ڈھنگ سے سمجھاتے ہوئے کہا------

''بچو......! کیا تمہیں معلوم ہے کہ گاندھی جی کے تین بندر تھے۔ پہلا بندر جو اپنا مُنہ اپنے ہاتھ سے بند کیے ہوئے ہے، اس کا مطلب ہے...... جھوٹ مت بولو اور بُری بات مُنہ سے نہ نکالو۔ دوسرا بندر جو اپنے ہاتھ سے اپنے دونوں کان بند کیے ہوئے ہے، اس کا مطلب ہے...... بُری بات مت سنو اور تیسرا بندر جس نے اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں، اس کا مطلب ہے...... بری اور گندی باتوں پر دھیان مت دو۔ ایسا کرنے والے پاپی ہوتے ہیں۔''

اسی دوران ایک لڑکا کھڑا ہوا اور پوچھنے لگا------

''سر......! تو کیا بُری بات بولنا، بُری بات سننا اور بُری باتیں دیکھنا سچ مچ پاپ ہیں؟''

''ہاں! ہر ڈھنگ سے پاپ ہے۔ ایسا کرنے والے پاپی ہوں گے۔''

ماسٹر صاحب نے اس لڑکے کو مزید سمجھاتے ہوئے مطمئن کیا۔ ماسٹر صاحب آگے کچھ بتانے ہی والے تھے کہ اسی لڑکے نے پھر کہا------

''سر......! مجھ سے بھی ایک پاپ ہو گیا ہے، میں اب کیا کروں......؟''

ماسٹر صاحب لڑکے کی بات سے بے حد فکر مند ہوئے، لیکن پھر بھی اس سے پوچھا------

''بیٹے......! تم سے کون سا پاپ ہو گیا ہے؟''

وہ لڑکا فوراً بول پڑا------

''میں نے کل آدھی چھٹی کے وقت آپ کو اور سیتا جی کو ایک کمرے میں......''

''کیا بکتا ہے، بے ہودہ......''

اس کی ادھوری بات کے دوران ہی ماسٹر صاحب غصّے سے بپھر گئے اور اُسے کلاس سے ہی نہیں بلکہ اسکول سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکلوا دیا۔!

☆☆☆

(ماہنامہ ''روبی''، نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۸۶ء)

شمع

آج اس کی زندگی کا یہ پہلا مُجرا تھا۔ وہ نئے اور خوبصورت لباس میں زیب تن، پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھرو کے ساتھ قیمتی اور خوبصورت قالین پر رَقص کررہی تھی۔ گھنگھرو اور موسیقی سے پُرکیف نغموں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ''اِنہی لوگوں نے......''

لوگوں کی نگاہیں اس کم سِن دوشیزہ کی طرف جمی ہوئی تھیں جس کا بھولا بھالا معصوم چہرہ، گول گول غزالی آنکھیں، کشمیری سیب کی مانند سُرخ ملائم گال، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے پتلے پتلے ہونٹ، چھریرا بدن، وہ جو رَقص کے دوران ناگن کی طرح بَل کھاتی ہوئی نظر آرہی تھی، اس رنگین محفل میں شریک ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ یہ نازنین کسی شاعر کے خیال سے بھی زیادہ حسین اور نازک ہے۔ طبلے کی تھپک پر رقص کرتا ہوا اس کا حسین جسم اور بھی زیادہ خوبصورت دِکھائی دے رہا تھا۔ جوش و خروش اور مستی کے عالم میں رَقص کرتی ہوئی شمع کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں روشنی میں چمک کر اُس کی خوبصورتی میں اور بھی اِضافہ کرہی تھیں۔ ایک طرف رئیس مداحوں

کی دادِ رقص کی گونجتی ہوئی آواز...... ''واہ! واہ!'' اور دوسری طرف نوٹوں کی بارش۔ ایک طرف کنارے بیٹھی ہوئی اس کی خالہ حیرت سے اُسے تک رہی تھی اور یہ سوچنے پہ مجبور تھی کہ آج تک اس نے زندگی میں اتنی کثیر رقم کی بارش نہیں دیکھی تھی۔

شمع کی تھرکتی ہوئی کمر اور اُس کے ناز و انداز کو دیکھ کر ہر شخص اُسے دیوانہ وار اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک شمع رقص کرتی ہوئی رُک گئی۔ کیونکہ اس کی نظر اس قندیل میں رکھی ہوئی شمع پر جا ٹکی تھی جو پہلے بڑے ہی آب و تاب سے روشن ہو کر خوش نُما معلوم ہو رہی تھی، لیکن اب زمین کی نذر ہونے والی تھی۔ گویا تمام ہونے کے بالکل قریب تھی جس کے بعد اُس کی جگہ دوسری شمع جلائی جائے گی۔ اور وہ اپنے نام سے مشابہ اُس شمع کو مبہوت ہو کر تکتی رہی جو جلد ہی بجھ گئی۔!

☆☆☆

(۱) ماہنامہ ''خوشبو''، نئی دہلی۔ جون ۱۹۸۲ء

(۲) ماہنامہ ''پالیکا سماچار، دہلی۔ ۱۹۸۴ء

جہدِ پیہم

وہ اب مکمل جوان ہو چکی تھی۔ اس میں بار بار کچھ عجیب اور انجانی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کون سی خواہش ہے جو اسے بے چین کئے ہوئے ہے۔ شائد جوانی ہی بے چینی کا سبب ہے جو اِس دور میں کچھ کر گزرنا چاہتی ہے۔ لیکن آخر وہ کون سا عمل ہے جس کے لئے طبیعت مچل رہی تھی۔ کیا اس عمل سے کچھ ہوتا بھی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو وہ کس طرح؟ سوالات کی زد میں وہ بے حد مبتلا ہو کر رہ گئی تھی، لیکن جواب سے محروم ہی تھی۔

اسے یہ محسوس ہونے لگا .... کہ اب ہم خلا میں آ پہنچے ہیں، زمین کی کشش سے باہر پھر اُسے اپنے وجود کا خیال آیا.......... کہ میں کون ہوں؟ میری تخلیق کس طرح ہوئی ہے؟ اُس نے اپنے آبا و اجداد کی تاریخ اُلٹی .... لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس کے والدین کون تھے؟ وہ اِس جواب سے اب بھی محروم تھی۔ پھر اُسے اپنی جوانی کا خیال آ گیا۔ اُس کے جسم میں ایک عجیب سی کسمساہٹ ہونے لگی۔ اسی بے چینی کے عالم میں اس کے ذہن کے پردے پر ایک شکل اُبھر آئی.......... وہ اس کی مخالف

جنس کی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر وہ جھوم اُٹھی، پھر اُسے اپنے وجود کا کچھ بھی خیال نہ رہا۔ تصوّر میں وہ کیف و مسرت کے گیت گانے لگی۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا............ کہ یہ کیف و مسرت عارضی ہے۔

خواب کا جب طلسم ٹوٹا، اس نے اپنے دِل کو قابو میں کیا۔ اور خلا میں تیزی کے ساتھ چکر کاٹنے لگی ....، اپنی چاہت اور خواہش کی تکمیل کی خاطر .... اپنی تمام باتوں کو بھول کر، برہ کے گیت آلاپنے لگی۔ اس کی صدا پوری فضا میں گونجنے لگی۔ شائد وہ اپنا وجود ختم کرنے کا اِرادہ کر چکی تھی۔ اس لئے وہ برق رفتاری کے ساتھ پورے خلا کا طواف کرنے لگی۔ اس کی اِس جہدِ پیہم کو دیکھ کر قدرت کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ اور پھر یکایک اُسے احساس ہوا .... کہ اس کی خواہش کی تکمیل ہوگئی ہے۔ جب وہ ساکن حالت میں آ گئی تب اُسے اپنے کوکھ میں ایک انجانے عمل کا احساس ہوا...... جو شائد تخلیقی عمل ہے۔

اور اُسے اپنے وجود کا بھی احساس ہو گیا......!!

☆☆☆

ماہنامہ ''شہود''، کلکتہ۔ ۱۹۸۵ء

پروانہ

ایک آواز آئی........... ''ون......!ٹو......!!تھری......!!!''

وہ ایک قدِ آور شمع کے قریب بیٹھی اس کے اِرد گرد پروانوں کے ہجوم کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ شمع جیسے ہی روشن ہوئی، ایک مریل اور بہت ہی چھوٹا پرندہ اس کے قریب تر ہوا اور پھر طواف کرنے لگا۔ بس ایسے ہی جیسے کوئی سانپ بین کی آواز سُن کر بین کے قریب آتے ہی مستی میں جھومنے لگتا ہے۔ بالآخر وہ پرندہ طواف کرتے کرتے جلد ہی شمع کی آغوش میں تھک کر سو گیا...... کہ یہی اس کی آخری خواہش بھی تھی۔

چند لمحے کے بعد پھر اَن گنت پرندے آئے جب شمع اپنے پورے شباب پر تھی۔ چھوٹے، بڑے، منجھولے، طرح طرح کے پرندے جاں نثاری کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک بڑا سا پرندہ بھی آیا۔ اس نے بھی خود کو پرستار ہونے کا دعویٰ کیا اور اسی دھن میں کئی چکر بھی لگائے۔ لیکن جب اس نے غور سے دیکھا کہ شمع کی جوانی ڈھل رہی ہے تب وہ دوسری شمع کی تلاش میں نکل گیا۔ جب شمع بجھ گئی تو سوائے پہلا مریل پرندہ، جو اُس کی آغوش میں خودسوزی کر کے ابدی نیند سو گیا تھا، کے علاوہ کوئی دوسرا پرندہ نظر نہ آیا۔

دوسری آواز آئی .... ''کٹ ......! او کے ......!!''

یہ فلم کا ایک منظر تھا جسے اداکارہ کومیلا کو شمع کے کردار کے رُوپ میں ایک شمع کے مشابہ تخیلانہ انداز میں دِکھایا جارہا تھا۔ جب سین اوکے ہوگیا تو ریسٹ (Rest) کے لئے اس اداکارہ کو چند لمحے کی فرصت دی گئی۔ فرصت کے لمحوں میں وہ اس سین میں کچھ اِس طرح کھوگئی کہ اسے اپنا پہلا محبوب یاد آگیا جو اُس کے عہدِ شباب اور اِس ظاہری چمکیلی دُنیا سے قبل اس کا پرستار تھا۔ اور وہ غریب اور مفلوک الحال بھی تھا۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی کہا جائے کہ وہ کافی جہدِ پیہم کے بعد بھی اپنی ترقی کی منزل پہ نہیں جاسکا اور پھر ایک دِن ایسا بھی آیا جب دُنیا کے رسم کے مطابق اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر وہ اِس رنگین دُنیا میں آگئی تھی جہاں وہ آج ایک حقیقی شمع کی طرح روشن ہے۔ اور جب تک روشن رہے گی ہزارہا پروانے اس کے گرد طواف کرتے رہیں گے۔ لیکن اس غریب اور مفلوک الحال پروانہ جیسا کوئی بھی نہ ہوگا جو آخر دَم تک اس کی آغوش سے قریب تر ہو۔ یکا یک وہ ڈائریکٹر اور فلم یونٹ کے کسی فرد کو کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے کار کو اِسٹارٹ کیا جسے یونٹ کے بھی لوگوں نے بھی دیکھا۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بعد اُس کی کار ایک گندی بستی میں جا کر رُک گئی تھی۔ اس نے بستی کے ایک فرد سے راجیش کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے بڑی بے رُخی سے صرف اتنا ہی کہا ——

''اس نے خودسوزی کر لی ہے ......!''

ماہنامہ ''پالیکا سماچار''، دہلی اور ماہنامہ ''شہود''، کلکتہ۔ ۱۹۸۶ء

قانون

پلیٹ فارم پر جیوں ہی ٹوئلوڈاؤن رُکی مسافروں کا ایک جھنڈ سیٹ حاصل کرنے کی غرض سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں بھی دیگر مسافروں کی طرح بوکھلاتا ہوا انجانے میں تھری ٹائر بوگی میں گھس گیا اور موقع پا کر ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ کچھ وقفے کے بعد...... گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اس لئے میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اسی اثنا میں سیاہ لباس میں ملبوس ایک ٹکٹ کلکٹر تمام کمپارٹمنٹ سے گھومتا ہوا میرے قریب بھی آ پہنچا اور ریزرویشن کی رسید طلب کی۔ رسید کی عدم موجودگی کے باعث مجھ کو وہ سیٹ چھوڑ کر دوسرے جنرل بوگی میں جانے کی ہدایت کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ قانوناً جرم ہے۔ اور پھر میری خالی کی گئی سیٹ پر دوسرے مسافر کو بیٹھا دیا جس کے پاس نہ تو رسید تھی اور نا ہی معقول ٹکٹ۔

اگلے اِسٹیشن پر مجھے وہ ڈبہ چھوڑنا پڑا کیونکہ میں نے صرف کرایہ کا ٹکٹ خریدا تھا جبکہ اس مسافر نے ٹکٹ کلکٹر سے نصف کرایہ میں اس کا قانون۔!

☆☆☆

''قومی آواز''، پٹنہ، میگزین اڈیشن

آئینہ آج کا

خواتین کی فلاح و بہبود کے تحت ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں صوبہ کے ایک وزیر بھی بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیے گئے تھے۔ اُنہوں نے صدر جلسہ کی اجازت کے بعد اپنی تقریر کا آغاز کیا..........

''ماتاؤں، بہنوں اور ہونہار بچیوں......! آج کا یہ جلسہ خواتین کی فلاح و بہبود کے تحت انعقاد کیا گیا ہے۔ جس میں ہم سبھوں کو خواتین کی فلاح و بہبود کے موضوع پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ پہلے مسائل پھر اُن کا حل...... جیسا کہ آپ بھی واقف ہیں کہ آج ہمارے ملک میں سب سے بڑا مسئلہ طوائفُ الملوکی کا ہے۔ جو کہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ نہ صرف عورت ذات کے لئے بدنُما دھبہ ہے بلکہ ہم مردوں اور ملک کے لئے بھی۔ اس کا خاتمہ اور اِس پر پابندی کا عائد ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کئی اہم مشورے ہیں۔ اگر اِس پر عمل اور کوشش کی جائے تو اس بُرائی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ویسے اِس ضمن میں قانونی مدد کے ساتھ ساتھ عوامی بیداری بھی بہت ضروری ہے۔ طوائفُ الملوکی کی سب سے بڑی وجہ غربت اور تلک و جہیز کی لعنت ہے۔''

تقریر کے دوران ایک خاتون اُٹھی ۔صدر جلسہ کے قریب گئی اور اُن کی اجازت پا کر پھولوں کا ہار لئے تقریر کرتے ہوئے وزیر موصوف کے قریب جا کر جیوں ہی وہ ہار اُن کے گلے میں ڈالنا چاہتی تھی کہ اُس خاتون اور وزیر کی جانی پہچانی صورتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔نظر نظر میں کئی شکوے اُبھرے .... یہ وہی شخص تھا جس نے ادنیٰ جہیز کی خاطر اُس خاتون کو نہ صرف ٹھوکر مار دیا تھا بلکہ اُسے ایک خاتون سے طوائف بھی بنا دیا تھا۔وزیر نے جھینپتے ہوئے جھٹ سے اپنی گردن نیچے جھکا دی تا کہ خاتون پھولوں کا ہار پہنا کر جلد رُخصت ہو۔لیکن وہ خاتون غصّہ سے پاگل ہو رہی تھی۔اُس نے وزیر کی جھکی گردن اوپر اُٹھائی اور ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر دے مارا اور اِسٹیج سے نیچے اُتر کر بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی۔!

☆☆☆

ماہنامہ ''شہود''، کلکتہ ۔۱۹۸۷ء

"دبستانِ عظیم آباد"، "بہار میں اُردو طنز وظرافت"، "تلاش وتجزیہ" اور "سانچ کو آنچ نہیں" سے متعلق اہلِ علم ودانشوروں کی آراء کے چند اقتباسات۔

○ (۱) سلطان آزاد نے اپنی تالیف "دبستانِ عظیم آباد" میں پٹنہ کے ایک ایسے عہد کو سمیٹ کر پیش کیا ہے۔ جس کا ماضی بھی حال کا آئینہ دار ہے۔ حالانکہ ادبی زبان میں ہمیشہ حال کو ماضی کا آئینہ دار کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں مؤلف نے ماضی کے آئینہ میں "دبستانِ عظیم آباد" کی جھلکیاں پیش کی ہیں، لیکن دراصل یہ مقصود نہیں بلکہ موضوع کے ارتباط کی خاطر ایسا کیا گیا ہے۔ اُن کا موضوع حال کے معمر ترین ادیب وشاعر سے لے کر وہ تخلیق کار بھی ہیں جنھوں نے ابھی تازہ بہ تازہ نو بہ نو اِس میدان میں قدم رکھا ہے۔ یہ انداز بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد کا تھا۔"

"......سلطان آزاد نے بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور نا کردہ کو "کردہ" بنا دیا ہے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ مگر اس کے پیچھے وہ جذبہ کارفرما تھا جو قدرت کسی کسی کو ودیعت کرتی ہے۔"

(مقالہ "سلطان آزاد اور دبستانِ عظیم آباد: ایک تعارف"۔ از: ناصر زیدی، مورخہ ۱۰ ارمارچ ۱۹۸۳ء)

○ (۲) "......دبستان عظیم آباد" میں سلطان آزاد نے جس دیدہ وری اور دُور رسی سے کام لیا ہے اور جتنی محنت کی ہے اِس کا صلہ اُنہیں اس صورت میں ملے گا کہ تاریخِ ادب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔"

......سلطان آزاد کی یہ تحقیقی کتاب احاطۂ عہد اور وسعتِ مضامین کے لحاظ سے بڑا کارنامہ ہے۔ انہوں نے دبستانِ عظیم آباد کے ماضی، حال اور مستقبل کے قلم کاروں کو جس طرح روشنی عطا کی ہے اس سے استفادہ ہر حال میں کیا جائے گا اور یہ کتاب مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

(دیباچہ: ''دبستان عظیم آباد'' ۔از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شعبۂ اردو، مارواڑی کالج، بھاگلپور)

o (۳) ''......سلطان آزاد کا ''دبستانِ عظیم آباد'' ایسا کارنامہ ہے جس کو اس صوبے کے کسی نامور محقق اور ناقد کو بوجہ احسن انجام دینا چاہئے تھا بہرحال 'اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند' یہ جرأت رندانہ مبارکباد کی مستحق ہے۔ اس نقشِ اوّل میں تحقیقی خامیاں مِل سکتی ہیں تنقیدی عنصر برائے نام ہے، لیکن نہ کرنے سے بہتر ہے کرنا۔ جناب سلطان آزاد کا یہ تجربہ مفید ہے، اُردو پبلک کے لئے اور خود مصنف کے لئے بھی۔''

سلطان آزاد نے محنت اور کوشش سے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کی قدر ضروری ہے۔

(تبصرہ: ''کتاب نُما''، دہلی۔ مارچ ۱۹۸۴ء)

o (۴) ''...... جناب سلطان آزاد نے دبستان عظیم آباد میں شہر عظیم آباد پٹنہ کے شاعروں، نثر نویسوں اور افسانہ نگاروں کے احوال زندگی اور کارناموں کا مختصر طور پر جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ایک قسم کا تذکرہ ہے جسے مؤلف نے بڑی کاوش و کوشش سے مرتب کیا ہے۔ اس تذکرے سے نہ صرف دورِ جدید کے ادیبوں کے مختصر حالاتِ زندگی اور کسب وکمالات سے واقفیت ہو جاتی ہے بلکہ ان کے آثار کے کچھ نمونے بھی مطالعہ کے لئے مِل جاتے ہیں۔''

''......عظیم آباد، پٹنہ کی گزشتہ ادبی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے جس سے عظیم آباد کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کا یہ حصّہ اصل موضوع کے لئے پس منظر مہیا کرتا ہے۔''

......اس کتاب سے عظیم آباد کی موجودہ ادبی سرگرمی کا مختصر علم ہو جاتا ہے۔ جس کی بنیاد پر مفصل وسیع تر تعارف و تشخص میں سہولت ہو سکتی ہے۔ اِس لحاظ سے سلطان آزاد صاحب کی یہ تالیف اہم سمجھی جاسکتی ہے۔

(تبصرہ: ماہنامہ ''آجکل''، نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۸۳ء از: پروفیسر سیّد حسن)

○ (۵) دبستان عظیم آباد دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصہ اوّل میں عظیم آباد کے ۱۹ویں صدی کے ربع آخر سے ۲۰ویں صدی کے ربع سوم تک کے ۹۷ شعراء کا تعارف مع زمانی ترتیب دیا گیا ہے اور حصہ دوم میں عظیم آباد کے ۳۱ مصنفین کو متعارف کرایا گیا ہے۔ دبستان عظیم آباد پہلی بار نومبر ۱۹۸۲ء میں بہار اُردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوا۔

ضخامت کے اعتبار سے دبستان عظیم آباد کے صفحات کی کل تعداد ۲۱۶ ہے، لیکن ان میں شعراء کے تراجم واحوال صرف ۸۸ صفحات پر بیان ہوئے ہیں (ص ۴۵ تا ۱۳۲)، شروع کے ۴۴ صفحات کی تقسیم اس طرح ہے۔ ابتدائی ۸ صفحات میں کتاب کا تعارف، فہرست، قطعہ تاریخ، اِنتساب، مشعل فرداد بستان عظیم آباد (منظوم تعارف دبستان عظیم آباد: رمز عظیم آبادی)، بعد ازاں ۶ صفحات (ص ۹ تا ۱۴) میں مناظر عاشق ہرگانوی کا دیباچہ ہے اور ۳ صفحات (ص ۱۵ تا ۱۷) میں عرض حال کے تحت دبستان عظیم آباد کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ۲۶ (ص ۱۸ تا ۴۳) صفحات میں تذکرہ نگار نے دبستان عظیم آباد ماضی کے آئینہ میں کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون قلمبند کیا ہے۔

......سلطان آزاد نے یہاں عظیم آباد کے سیاسی اور ثقافتی حالات نیز ادبی پس منظر اور وہاں کی علمی وادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بہار کے مہاجر اور قدیم شعراء کا اجمالاً تعارف پیش کیا ہے۔ مزید برآں قدیم مصنفین کی ادبی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

......تذکرہ نگار نے شعرا کے خاندانی پس منظر، سلسلۂ تلمذ، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام نیز شعرا کی نثری تصانیف سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ علاوہ ازیں دبستان عظیم آباد میں شعرا کے کلام اور معائب ومحاسن شعری پر بے لاگ نقد وتبصرہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

......سلطان آزاد کا یہ تذکرہ و تاریخ عظیم آباد اور عظیم آباد کے شعراء و اُدبا سے متعلق ایک ادبی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

(اُردو تذکرہ نگاری۔۱۸۳۵ء کے بعد۔از: ڈاکٹر رئیس احمد، ص ۳۷۴)

○ (۶) ''......پیش نظر کتاب ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' کے علاوہ اپنی تصنیف ''دبستان عظیم آباد'' کی اِشاعت کے بعد اپنی تالیفی اور تصنیفی صلاحیتوں سے اُردو داں و اُردو خواں طبقہ کو روشناس کرا چکے ہیں۔ان کی متحرک شخصیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم و ادب کی سچی اور بے لوث خدمت کا وہ بھر پور جذبہ رکھتے ہیں چنانچہ مظہر عظیم آبادی مرحوم تلمیذ شاد عظیم آبادی کا شعری مجموعہ ''شمع محفل'' شائع کرایا جس کی ترتیب اور تدوین بیّن ثبوت ہے کہ ادبی خدمت کا احساس بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔جس کے نتیجہ میں کئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔

پیش نظر کتاب ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' کا مسودہ میری نظر سے گزر چکا ہے۔ اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اِس کے مصنف نے وقت کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا کام کیا ہے جو یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

...... بہار میں اُردو طنز و ظرافت سے تعلق اب تک کوئی ایسی کتاب منظر عام پر نہیں آسکی جس میں یہاں کی ظرافت نگاری اور طنز نگاری کے تواریخی شواہد کو مدّ نظر رکھ کر احاطہ کیا گیا ہو۔اس کمی کا احساس سلطان آزاد کو ہوا اور وہ اپنی بساط کے مطابق اُنہوں نے کارکردگی کا ثبوت دیا جس کے نتیجہ میں یہ کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

(تقریظ: ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت''۔
پروفیسر نادم بلخی، سابق صدر شعبۂ اردو (پی. جی.)
جی. ایل. اے. کالج، ڈالٹن گنج (پلاموں)

○ (۷)......سلطان آزاد کی یہ تالیف اس کی غماز ہے کہ مؤلف اور صنفِ تحقیق میں گہرا یارانہ ہے۔ مؤلف کی پہلی تخلیق ''دبستان عظیم آباد'' بھی تحقیق و تذکرے کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ تحقیق و تذکرہ سنگلاخ زمین سے جوئے شیر رواں کرنے کا عمل ہے۔

''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' پر یہ پہلی کتاب ہے۔ تذکرہ نویسی کے ضمن میں مذکور کتب کی خصوصیت یہ ہے کہ سلطان آزاد نے اپنی کتاب میں جدّت سے کام لیا ہے یعنی بہار کے ۳۵ طنز و مزاح نگاروں کی تصاویر بھی یکجا کی ہیں۔ مؤلف نے ''دو باتیں'' عنوان قائم کر کے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ غور طلب ہیں۔ تقریظ میں صدر شعبۂ اُردو جی.ایل.اے. کالج، ڈالٹین گنج، پروفیسر نادم بلخی نے سلطان آزاد کی ادبی شخصیت کا پیارا سا نقشہ پیش کیا ہے۔ علاوہ بریں مؤلف نے بہار میں اُردو طنز و ظرافت سے متعلق ایک جامع مضمون شامل کتاب کیا ہے۔ ان کی یہ تحریر ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

......قاری کو مطالعہ کے دوران راہِ ظرافت کے بہت سے سنگ میل نظر آئیں گے۔ یعنی اس کتاب کے اسیران ''طنز و ظرافت'' نے کس عمر میں جامِ ظرافت نوش کیا، کب توبہ کی اور کب توڑی اور کون ماضی تا حال علم ظرافت بلند کئے ہوئے ہے۔ یہ سب واضح ہو جائے گا۔

(تبصرہ: ماہنامہ ''کتاب نما''، دہلی۔ فروری ۱۹۹۱ء مبصر: سیّد فیاض الرحمٰن)

○ (۸)......سلطان آزاد نے ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' کے موضوع پر تمام اہل قلم کو بڑے سلیقے سے یکجا کر دیا ہے۔ اِس طرح اُنہوں نے اسے حوالہ جاتی ادب کا ایک عمدہ نمونہ بنا دیا ہے۔

......الغرض، یہ کتاب بہار کے نوے طنز و مزاح نگاروں سے متعلق ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو ادب کی وضاحتی کتب کی فہرست میں اس کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔

(تبصرہ: پٹنہ ریڈیو کی اُردو سروس سے نشر۔ مبصر: ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال)

○ (۹) زیرِ نظر کتاب ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' اِس لحاظ سے اہم تصوّر کی جا سکتی ہے کہ اس میں صوبۂ بہار کے نوّے (۹۰) شعراء اور اُدبا کے مختصر حالات، ان کی ادبی کارنامے، نمونۂ کلام اور نثری اِقتباسات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ادبا اور شعراء کا یہ خوبصورت گلدستہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ سرزمین بہار کے ادبی گلستان میں کس کس طرح پھول کھلتے رہے ہیں۔ اُردو طنز و ظرافت میں جن بعض اہم شخصیات نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے ان میں علامہ فضل حق، یگانہ چنگیزی، علامہ جمیل مظہری، ناوک حمزہ پوری، مظہر امام، اسرار جامعی، مناظر عاشق ہرگانوی، انجم مانپوری، شین مظفر پوری، وہاب اشرفی اور تمنا مظفر پوری جیسے ادبا اور شعراء کے نام بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

پٹنہ کے جواں سال ادیب سلطان آزاد نے اُردو طنز و ظرافت کے ادبا اور شعراء کی فہرست مرتب کر کے اُردو کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ ادبی اور تاریخی حیثیت سے یہ خدمت انتہائی اہمیت کی حامل ہے نیز اس بات کی بھی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ بہار کے شعراء و ادبا اور صحافیوں کی ایک عمومی ڈائرکٹری بھی مرتب کی جائے۔ اُردو سے محبت رکھنے والے ہر فرد کو یہ کتاب خرید کر اپنی لائبریری میں رکھنی چاہئے۔

(اُردو بک ریویو، نئی دہلی، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۸ء، مبصر: عارف اقبال)

○ (۱۰) ''تلاش و تجزیہ'' سلطان آزاد کی نئی کتاب کا نام ہے۔ پہلے ''دبستان عظیم آباد'' اور پھر ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' کی اشاعت کے ساتھ سلطان آزاد اپنے آپ کو متعارف کرا چکے ہیں۔ ''اردو ادب میں طوائفوں کا حصہ''، ''اُردو ادب میں عیسائیوں کا حصہ''، ''دلی کے قدیم ظرافت نگار شعرا''، ''تلامذہ شادؔ''، ''فیضان رمزؔ''، یہ چند عنوانات ہیں جن کے تعلق سے اس کتاب میں مضامین شامل ہیں۔

......جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ''تلاش و جستجو'' سے سلطان آزاد کی گہری وابستگی

ہے چنانچہ اپنے مضامین کے عنوان میں بھی وہ اس لفظ کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں، جیسا کہ ان کے مضمون ''تلاش پرویز شاہدی'' کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے پرویز شاہدی کے ان گوشوں کی تلاش کو اپنا مقصد بنایا ہے جس پر کسی ادیب یا ناقد کی نظر نہیں گئی ہے۔ پرویز شاہدی کی شاعری میں اشتراکیت ورومانیت کی کشمکش سے الگ ہٹ کر ان کی ظرافت نگاری اور نثر نگاری کے تعلق سے چند اہم گوشوں کو اِس مضمون میں اُجاگر کیا ہے۔ ''فراق کا صحیفہ رومان''، ''گل نغمہ'' بھی ایک ایسا مضمون ہے۔ البتہ ''رمز عظیم آبادی: جائزہ در جائزہ'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں مصنف کی تنقیدی و تجزیاتی صلاحیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ یہی ایک مضمون جو تجزیاتی نوعیت کا ہے، باقی مضامین تلاش وجستجو کے ماحول کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ بہر حال ''تلاش و تجزیہ'' جو اِس کتاب کا نام ہے وہ اپنے آپ میں کتاب کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

(رسالہ ''قصے''، دہلی اور روشنائی، کراچی۔ مبصر ڈاکٹر جاوید حیات)

o (۱۱) سلطان آزاد کی نثری تخلیقات میں نقد و تحقیق کا مساویانہ حسین توجہ کا باعث ہے۔ اس حالیہ مجموعہ میں گیارہ مضامین شامل ہیں۔ جن میں کم وبیش تلاش و تجسس کا وہی حسن موجود ہے جو نقد و تحقیق کے بنیادی عناصرات ہیں۔ انہوں نے فنی چابکدستی کے ساتھ مطالعاتی تجربے کو بیانیہ اطوار کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی تحریرات سے عصر کی اور عصر سے متعلقہ اشخاص و نظریات اور ادبی تہذیبی رویّوں کی مصوّری میں مدد مل جاتی ہے۔ تحقیقی مواد کو منضبط رکھنے میں حق ادب اُصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے۔ اسی لئے کوئی تجربہ یا چہرہ ادھورا یا غیر معتبر نظر نہیں آتا۔ شادؔ اور رمزؔ سے متعلق ان کے رشحاتِ فکر سے ان کی اپنی فکری وذہنی وابستگی کا اظہار مثبت طور پر ہوا ہے۔ اسی طرح گل نغمہ اور چار چہرے کا تجزیاتی مطالعہ بھی ان کی وسعت نظر کا اشاریہ ہے۔ یہ کتاب اچھی نثر کی اچھی مثال ہے۔

(اُردو بک ریویو، نئی دہلی، مارچ۔ اپریل ۲۰۰۱، مبصر: ساحل احمد)

o (۱۲) جہاں سلطان آزاد اپنے تحقیقی و تنقیدی موضوعات سے اُردو ادب کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں وہیں وہ افسانے، ڈرامے اور تبصرے وغیرہ میں بھی اپنے وجود کا احساس دِلاتے رہے ہیں۔ اس حساب سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں اچھا ادب پیش کرنے کے جراثیم بڑی حد تک موجود ہیں۔ اُنہوں نے جس موضوع پر بھی کام کیا ہے نئی بات بتانے کی کوشش کی ہے۔

بہر حال ''تلاش و تجزیہ'' میں شامل تمام مضامین انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کو جذباتی انداز میں مسحور نہیں کرتے مگر اس کے شعوری احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسے بھٹکنے بھی نہیں دیتے اور نہ ہی گنجلک خیالات سے اسے تذبذب کا شکار ہی بنا دیتے ہیں۔ اور جو بھی کرتے ہیں صاف و شفاف انداز میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں، تحریر کی یہی خوبی سلطان آزاد کو ایک اچھا نقاد و ادیب ہونے کے لئے کافی ہے۔ اس خوبصورت کتاب کی اشاعت کے لئے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

(اقتباس ''تلاش و تجزیہ کا مسافر۔ سلطان آزاد'' از: واجد اختر صدیقی۔ زرّیں شعاعیں، بنگلور دسمبر ۲۰۰۴ء)

o (۱۳) سلطان آزاد خاموشی کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں میں ہیں۔ تنقید و تحقیق سے انہیں بطور خاص لگاؤ ہے۔ انہیں اِس بات کا احساس بھی ہے کہ اس وادی میں قدم جمانے کے لئے حد درجہ محنت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سنجیدگی اور مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے ذریعے ادب کے سنجیدہ حلقوں کو متاثر کیا ہے۔ ۱۹ سال قبل انہوں نے اپنی کتاب ''دبستان عظیم آباد'' کے ذریعے ایک عہد کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی تھی جو بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔ ''بہار میں اُردو طنز و ظرافت'' بھی ان کی ایک عمدہ کاوش ہے جو ۱۲ سال قبل منظر عام پر آئی تھی۔

''تلاش و تجزیہ'' ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں فکشن اور شاعری پر قابلِ ذکر مضامین ہیں۔ ''تلاش و تجزیہ'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان آزاد کا مزاج فکشن سے زیادہ میل کھاتا ہے۔ اگرچہ اُنہوں نے شعری محاسبے کے دوران بھی متوازن رائے پیش کی ہے، لیکن فکشن سے متعلق مضامین میں ان کی تنقیدی بصیرت زیادہ اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ بیسویں صدی کی آخری تین چار دہائیوں میں سعادت حسن منٹو کی بازیافت میں تیزی آئی ہے۔ متعدد حوالوں اور زاویوں سے منٹو کی تفہیم کا سلسلہ جاری ہے۔ سلطان آزاد نے بھی اپنے لحاظ سے منٹو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے فن کا جائزہ لینے کے دوران مصنف نے انہیں اپنے آپ میں ایک دبستان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے اس رائے میں جذبات کا خاص دخل ہو، لیکن بہر حال اس نہج پر گفتگو تو کی ہی جاسکتی ہے۔ ''تلامذۂ شاد'' تحقیقی اعتبار سے ایک اہم مضمون ہے۔ اس کے علاوہ ''اُردو ادب میں طوائفوں کا حصہ''، ''تلاش پرویز شاہدی'' اور ''فراق کے گل نغمہ'' پر مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

(کتاب نما، دہلی۔ ستمبر ۲۰۰۱ء۔ مبصر: راشد انور راشد)

o (۱۴) ''تلاش و تجزیہ'' کے مصنف سلطان آزاد صاحب کا نام اُردو ادب میں کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ اُنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے ساتھ اُردو ادب کی خدمت کو اپنا ایک اہم فریضہ قرار دیتے ہوئے تحقیق و تنقید کے میدان کو زندگی کا ایک اہم شغل بنایا اور اِس طرح انہوں نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی کام کو جاری رکھا ہے۔

لائقِ ذکر یہ ہے کہ سلطان آزاد ہندوستان کے ایک ایسے سرسبز شاداب خطہ عظیم آباد سے تعلق رکھتے ہیں جو اُن کا مولد بھی ہے نیز ادبی دُنیا میں ایک امتیازی شناخت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ جائے ولادت سے محبت نے یہاں کے ادباو شعراء سے خاصی اُنسیت پیدا کردی اور اُنہوں نے عظیم آباد کے بعض ایسے گوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوششیں شروع کردیں جن کو

اب تک ادب میں قابلِ ذکر مقام حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اِس کا ثبوت دیگر تصانیف کے ساتھ ''دبستان عظیم آباد'' ہے۔ ''دبستان عظیم آباد'' لکھ کر موصوف نے اُردو ادب میں اپنا اہم مقام متعین کر لیا ہے۔

''تلاش و تجزیہ'' بھی آزاد صاحب کی ایک ایسی ہی تخلیق ہے جس میں عظیم آباد نیز دیگر علاقوں سے وابستہ ادبا، شعراء، ناقدین، مصنفین، افسانہ نگار اور مزاح نگار کی ادبی خدمات سے نہ صرف روشناس کیا ہے بلکہ ان کی شاہکار تخلیقات کا فنی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

(تبصرہ ماہنامہ ''محفل صنم''، دہلی۔ اگست ۲۰۰۳ء مبصر: ڈاکٹر مسز شمیم اختر، صدر شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس)

o (۱۵)...... زیرِ نظر کتاب چھوٹی چھوٹی پانچ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانیاں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اس لئے ان کو بچوں کی نفسیات اور ان کی سمجھ بوجھ کا اچھا ادراک ہے جس کی وجہ سے ان کی کہانیاں نہایت آسان اور سیدھی سادی زبان میں ہیں۔ کتاب میں صرف ایک کہانی ''محنت کا پھل'' ایسی ہے جو کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام کہانیاں ''پیام تعلیم''، دہلی اور سہ ماہی ''شفق''، پٹنہ میں شائع ہو کر بچوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اب سلطان آزاد صاحب نے ان کہانیوں کو کتابی شکل میں یکجا کر کے بچوں کو ایک خوبصورت تحفہ عنایت کیا ہے۔ اُمید ہے اس کتاب کے مطالعے سے لطف اندوز ہوں گے۔

(اُردو بک ریویو، نئی دہلی، جولائی۔ اگست ۲۰۰۲ء، مبصر: عادل اسیر دہلوی)

o (۱۶) ''سانچ کو آنچ نہیں'' بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اِس میں پانچ کہانیاں ہیں۔ لالچ، سانچ کو آنچ نہیں، تدبیر اور تقدیر، بڑے لوگ چھوٹا دِل اور محنت کا پھل، یہ بھی کہانیاں سبق آموز ہیں۔

سلطان آزاد نے بچوں کی نفسیات، ان کی عمر اور معیار کا خیال رکھتے ہوئے ان کہانیوں کو نہایت سلیس اور سادہ زبان میں قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے گردو پیش میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے کہانی کی شکل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں لطف کے ساتھ اثر انگیزی کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔

یہ مجموعہ ہر لحاظ سے لائق توجہ ہے انداز بیان مؤثر ہے۔

(ماہنامہ ''کتاب نما''، دہلی۔ ستمبر ۲۰۰۲ء، مبصر: تجمل حسین خاں)

===========

مصنّف کی تصانیف

(۱) دبستان عظیم آباد (تحقیق و تذکرہ) ۔۱۹۸۲ء

(۲) شمعِ محفل از مظہر عظیم آبادی (ترتیب و تدوین) ۔۱۹۸۷ء

(۳) بہار میں اُردو طنز و ظرافت (تحقیق و تذکرہ) ۔۱۹۸۹ء

(۴) تلاش و تجزیہ (تحقیق و تنقید۔ مضامین) ۔۲۰۰۰ء

(۵) سانچ کو آنچ نہیں (بچوں کی کہانیاں) ۔۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۹ء

(۶) عظیم سائنسدانوں کی کہانیاں (بچوں کیلئے) ۔۲۰۱۱ء

(۷) آئینہ آج کا (افسانے) ۔۲۰۱۴ء

☆☆☆

Aaina Aaj ka

by Sultan Azad

arshia publications

arshiapublicationspvt@gmail.com

A for Arshia Publications